ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۱۴

دوسرا سال: دوسری کتاب

فروری ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey@poetic.com
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ لندن کی ایک رات — محمد سلیم الرحمٰن — ۵
۳۔ کشور ناہید کی نظم بیداری نسواں سے بیداری انساں تک — ڈاکٹر عصمت جمیل — ۱۰
۴۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۴) — ابن حسن — ۲۶
۵۔ پیامِ مشرق از فیض احمد فیض — ایم خالد فیاض — ۳۷

کہانی:

۶۔ آؤٹ پوسٹ آف پروگرس — جوزف کانریڈ/ڈاکٹر فاروق عثمان — ۴۳

سلسلہ وار ناول:

۷۔ ایک مرد (قسط ۸) — اوریانا فلاشی/خالد سعید — ۶۴

غزلیات:

۸۔ کہاں جاتے ہیں آگے شہرِ جاں سے — رسا چغتائی — ۷۴
۹۔ محبتوں سے مجھے منزلیں بلاتی ہیں — ارشد ملتانی — ۷۵
۱۰۔ جس کو سوچا تھا سمجھا تھا وہ کیا ہوا — ارشد ملتانی — ۷۵
۱۱۔ ہے تیرگی شام الم صبح عید رنگ — ارشد ملتانی — ۷۶
۱۲۔ کھلی آنکھ سے ہر نظارہ کرونگا — ارشد ملتانی — ۷۶
۱۳۔ آسمانوں سے ہوا جس دم اشارہ شام کا — ارشد ملتانی — ۷۷
۱۴۔ گریہ- اِس بات کا گویا اعلان — قاضی حبیب الرحمٰن — ۷۸
۱۵۔ حصارِ ذات سے ایسے نکل رہا ہے کوئی — فہیم شناس کاظمی — ۸۰
۱۶۔ دیکھا ہے اُسے پردۂ افلاک سے آگے — فہیم شناس کاظمی — ۸۰
۱۷۔ قصّہ کروں مختصر ہوا کا — پرویز ساحر — ۸۱
۱۸۔ سنبھالے گا ہمیں کیا غم ہمارا — کاشف حسین غائر — ۸۲
۱۹۔ آگ ایسی نہ دُھواں ایسا ہے — کاشف حسین غائر — ۸۲

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۸۳

سید عامر سہیل

چند باتیں

بعض اوقات یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید ہمارے یہاں لکھنے کا عمل رفتہ رفتہ اک میکانکی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اِس بات کا ادراک کیے بغیر کہ ہم کیوں لکھتے ہیں اور کس کے لیے لکھتے ہیں، محض لکھنے اور لکھتے چلے جانے کا بے کار عمل جاری ہے۔ ہر روز بیسیوں کتابیں دلکش رنگوں اور اشتہاروں کی شکل میں اشاعتی مراحل سے گزر کر کتب خانوں تک پہنچ رہی ہیں۔ نفیس کاغذ، اعلیٰ چھپائی، بہترین جلد اور بھڑکیلے سرِ ورق کے ساتھ یہ کتابیں جا بجا نظر آ جائیں گی۔ مگر موضوعاتی معیار اور فنی حوالوں سے یہ تیسرے درجے کا اَدب کہلانے کے بھی لائق نہیں ہوتیں۔ اِن میں اکثر تو شعری مجموعے ہوتے ہیں اور باقی سفرناموں کے نام پر روزانہ کی ڈائریوں کو بغیر ترتیب کے شائع کر دیا جاتا ہے۔ تاہم ایک آدھ کتاب ہی ہفتوں، عشروں کے بعد قابلِ مطالعہ ہاتھ لگتی ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ بعض اچھی کتابیں اِس ''جمعہ بازار'' میں کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے کہ جدید سہولیات نے کتاب کی اشاعت کو بہت آسان اور معیاری بنا دیا ہے تاہم اِن سہولیات سے زیادہ تر فائدہ وہ اُٹھا رہے ہیں جن کا اَدب سے تعلق نہایت سرسری اور سطحی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں نئے لکھنے والے صاحبِ کتاب بننے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں (اور یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں) مگر تخلیقی عمل کے لیے جس محنت، ریاضت، گہرائی اور وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے عام طور پر تہی ہوتے ہیں۔ اب تو ایک اور دلچسپ صورتِ حال بھی دیکھنے میں آ رہی ہے کہ کتاب کے ساتھ فلمی مکالموں پر مبنی ''وش کارڈز'' اور ''لو لیٹرز'' بھی ہمراہ ہوتے ہیں جو عموماً سستی جذباتیت اور نوعمری کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کتاب کی فروخت بڑھانے کا ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ یہ ''بازاری پن'' نئے اور بعض سینئر شاعر بھی اپنائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتابوں کی یہ بھرمار اور کمپنی کے اشتہاروں کی مانند رنگین سرِ ورق، ''کس کے لیے اور کس لیے'' ایسے سوالات سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔

کیا یہاں یہ سوال جنم نہیں لیتا کہ ہمارا آج کا ادب کسی نظریاتی وابستگی اور فکری بلندی سے آری ہوتا چلا جا رہا ہے۔۔۔۔؟ ادب میں مقصدیت اور نظریاتی وابستگی کو ہدفِ تنقید بنانے والوں اور تخلیق کو محض ''انفرادی کارکردگی'' قرار دینے والوں کے لیے کیا یہ ہزاروں کتابیں کوئی پیغام نہیں دیتیں؟ ''انفرادی کارکردگی'' کا سوال جس قدر رومانوی اور ''آزادی'' جس قدر دل آویز خیال ہے اُس کا منطقی

نتیجہ کیا نکلا۔۔۔۔؟ ادب کو کسی نظریاتی وابستگی اور مقصدیت سے دور تر کرنے کو کیا کہا جائے گا؟ دکھ تو یہ ہے کہ آزادی، انفرادی کارکردگی اور مقصدیت کو بوجھ کہنے والے خود کسی ''شخصی وابستگی'' کنوئیں ایسی آزادی اور ذاتی منفیت پر مبنی ''مقصدیت'' کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک مرتبہ پھر آج کا اہم سوال بنتا جا رہا ہے۔

گذشتہ دنوں اپنے ایک سینئر دوست (جو کہ خود بھی باکمال شاعر ہیں، محنت و ریاضت کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور شعری حلقوں میں خاصے ممتاز ہیں) کے ساتھ دورانِ گفتگو پتہ چلا کہ وہ آج کل بہت تیزی سے غزلیں لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک حیران کُن بات تھی۔ میں نے بڑے تعجب سے اِس کا سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ کسی ''صاحبِ ثروت'' کے لیے غزلیں کہہ رہے ہیں، جن کا اُنہیں خاصا معقول معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔۔۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس صاحبِ ثروت کے شعری مجموعے خوبصورت گیٹ اَپ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور ملکی سطح پہ نہایت قابلِ احترام سینئر ادباء اور شعراء نے اپنے آراء بھی مجموعوں پر درج کی ہیں۔ اگرچہ یہ روایت کوئی نئی نہیں تاہم آج کے دور میں ادبی فضا کو مکدر بنانے اور اُس کا اعتبار کھونے میں اِن رویوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

اِس ساری صورتِ حال میں لکھنے کے سنجیدہ عمل کو جس طرح غیر سنجیدہ (معاف کیجیے گا) بے ہودہ بنا دیا گیا ہے وہ ہمارے مجموعی فکری انحطاط کی خبر دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے غیر سیاسی رویے جمہوری اقدار کو ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔۔۔۔ کاش ایسے ادبی رویوں کی بھی ''ڈی بریفنگ'' ہو سکے مگر افسوس کہ اب یہ اصطلاح بھی کوئی زیادہ قابلِ اعتبار نہیں رہی۔

☆☆☆

محمد سلیم الرحمٰن

لندن کی ایک رات

شہرہ آفاق ہسپانوی ناول نگار 'سیروانتیس' کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ وہ اول و آخر شاعر ہے اور وہ بھی بڑے پائے کا۔ چناں چہ جب اس کے ناول ''دون کیخوتے'' کی ملک بھر میں دھوم مچی تو وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ سچ یہ ہے کہ وہ بہت برافروختہ ہوا۔ اس کی رائے میں ''دون کیخوتے'' محض ایک طرح کا دل بہلاوا تھا، اسے تفریحِ طبع کے واسطے پڑھا جا سکتا تھا۔ سیروانتیس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی شاعری اور منظوم ڈرامے، جنہیں اس نے کمال سنجیدگی اور عرق ریزی سے قلم بند کیا تھا، آخر کیوں مقبول نہیں ہوے۔

اس طرح کی حیرانی یا پریشانی سے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو واسطہ پڑ چکا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ عجیب سے مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جو تحریریں، ان کی اپنی دانست میں، شاہکار کا درجہ رکھتی تھیں، انہیں اول تو سراہا ہی نہیں گیا اور اگر سراہا بھی گیا تو نیم دلی سے۔ اس کے برعکس ان کی اس تصنیف نے، جس پر انہوں نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی تھی اور بے فکری کے عالم میں قلم برداشتہ لکھ ڈالا تھا، پڑھنے والوں کے دل پر جادو کا سا اثر کیا۔ اسے ادب میں بیش بہا اضافہ قرار دیا گیا۔ کس کا فیصلہ درست تھا؟ مصنف کا یا قارئین کا؟ معلوم یہی ہوتا ہے کہ قارئین صحیح نتیجے پر پہنچے تھے لیکن جس طرح مصنف حضرات اپنے تخلیقی کارناموں کے بارے میں قسم قسم کے مغالطوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں اسی طرح یہ بات خاصی غلط ہے کہ کسی کتاب کا ایک وقت میں بہت پڑھا جانا اس کی عمدگی کی پختہ دلیل ہے۔ جن کتابوں کو کسی دور میں لوگ سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور سینت کر رکھتے ہیں، جو مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیتی ہیں، زمانہ بدلتے ہی ان کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں رہتا۔

بہرصورت، کسی مصنف کی بدترین غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی منصب کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی غلط خیال کے زیر اثر وہ تصنیف کے عمل سے ہاتھ کھینچ کر ایسے مشاغل اپنا لے جو، اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد، خود اس کے لیے بہت کم معنی رکھتے ہیں اور جن سے اس معاشرے کو، جس کا وہ رکن ہے، مشکل سے کوئی فیض پہنچ پاتا ہے۔ تصنیف سے کنارہ کشی اختیار کرنے والے اہلِ قلم کو ان عورتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو اپنے وجود میں کسی نئی زندگی کی کلبلاہٹ محسوس کرتے ہی اسقاطِ حمل کا سوچتی ہیں یا صرف ایک بچہ جننے کے بعد رحم بریدگی کا تہیہ کر لیتی ہیں۔ اسی طرح بعض مصنف بھی ایک کتاب لکھنے کے بعد کاغذ قلم کو ہاتھ لگانے کے خیال سے یوں بدکتے ہیں جیسے جان کے لالے پڑ گئے ہوں۔ صاحبِ قلم ہونے کی ذمے داری سے بچنے کے لیے وہ کوئی بھی انتہائی قدم

اُٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی اُٹھ کر جان جوکھوں کی مہم پر چل پڑتا ہے، کسی کو فوج میں بھرتی ہونے کی سوجھتی ہے، دہشت گرد یا باغی بن کر جینا بھی قبول ہے۔ مختصر یہ کہ ہر اس کام کو بلا تامل اپنا لیتے ہیں جس میں ہر وقت سر پر خطرہ منڈلاتا رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جان پر کھیل جانا آسان ہے، کتاب لکھنا مشکل۔ ان کی حرکات دیکھ کر ایوری پیدیس کی ہیروئن، میدیا کا یہ قول ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے: ''ایک دفعہ بچہ جننے کے بجائے اگر مجھے نیزہ تان کر صفِ جنگ میں تین بار بھی کھڑا ہونا پڑے تو منظور ہے۔''

سجاد ظہیر کا نام جدید اُردو ادب کے فراریوں کی فہرست میں درج ہے۔ سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' کے نام سے ایک مختصر سا ناول لکھا اور پھر کسی پس و پیش کے بغیر فکشن کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ ادب ہی وہ میدان تھا جس میں پاؤں جما کر وہ کوئی کارِ نمایاں انجام دے سکتے تھے اور انہوں نے ہمیں ممنون ہونے کا موقع فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ ناول کے شروع میں ایک چند سطری تمہیدی، بلکہ تہدیدی، نوٹ ہے جس میں بڑے روکھے پن سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ ''لندن کی ایک رات'' جیسا کوئی اور ناول تحریر نہیں کریں گے۔ کیوں تحریر نہیں کریں گے؟ اس کی وضاحت بھی موجود ہے۔

> ''اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسودے کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر چند مخصوص جذباتی کش مکش سے متاثر ہو کر سوڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

مذکورہ بالا بیان کا اختصار قابلِ توجہ ہے۔ بظاہر لگی لپٹی بات کوئی نہیں۔ جو کہنا ہے دوٹوک کہہ دیا ہے لیکن اس بیان پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو مضمرات پر نظر جاتی ہے۔ پہلے تو یہ کہ یہاں لکھنے کے عمل کے بارے میں ایک ڈھکا چھپا سا تحقیری رویہ موجود ہے۔ فکشن نگاری کو ایک انفعال سرگرمی گردانا گیا ہے جو عمل پسندی، سرگرم شراکت، فعال مشغولیت وغیرہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اپنے لکھے ہوئے کے بارے میں مکمل طور پر غلط رائے قائم کی ہے۔ ناول کو ایک ناپختہ، جذباتی غلط کاری قرار دے کر بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ بے شک، آپ اس امر کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں کہ سجاد ظہیر نے یہ نہیں کہا کہ وہ آئندہ فکشن نہیں لکھیں گے۔ انہوں نے صرف یہ بیان دیا ہے کہ وہ ''لندن کی ایک رات'' جیسی کوئی چیز لکھنے کا ارادہ اب نہیں رکھتے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعد فکشن نہیں لکھا اور قاری یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ تمہیدی نوٹ میں مذمت یا حقارت کا

جو پہلو بین السطور دکھائی دیتا ہے اس کا اطلاق ہر طرح کے فکشن پر مقصود ہے۔

سجاد ظہیر جیسے شخص سے اتنی چونکا دینے والی غلطی کیسے ہوئی؟ آخر انہیں یہ کیوں نہ سجھائی دیا کہ انقلابی سرابوں کے پیچھے بھاگتے پھرنے کے بجائے بطور فکشن نگار وہ برصغیر کے عوام کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں؟ ہمیں نہیں معلوم ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیت کو معمولی معمولی کاموں کی بھینٹ چڑھا دیا اور ادب کے میدان پر بہت ہی کم توجہ دی۔ اب تو یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں انہیں بھلا ہی نہ دیا جائے۔ سجاد ظہیر کے مقابلے میں سبط حسن نے زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیا اور جن عقائد کے قائل تھے ان کی پُر زور ترجمانی کر کے اپنے عہد کی دانشورانہ فضا کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت سجاد ظہیر سے کم تر درجے کی تھی۔

''لندن کی ایک رات'' محض خواندنی نہیں بلکہ آج بھی پڑھے جانے کے قابل ہے۔ یہ دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتا کیوں کہ فی الاصل، برصغیر میں اور برصغیر سے باہر، اس وقت سے اب تک، ناموں اور اصطلاحوں کے سوا، کچھ بھی نہیں بدلا۔ آج بھی نوجوان تعلیم حاصل کرنے مغربی ممالک جاتے ہیں اور اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جن کا ناول میں ذکر ہے۔ آج بھی ان سے رنگ و نسل کی بنا پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ سفید فام عورتوں سے ان کے تعلقات کے اردگرد شکوک اور بدظنی کے سائے بدستور منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ان کی غیر موجودگی کے دوران میں خود وطن میں جو افراتفری مچی رہتی ہے اس پر وہ گھبراتے اور چونکتے بھی ہیں اور جذباتی خلفشار کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ ساٹھ سال گزر گئے اور یوں لگتا ہے کہ وقت وہیں کا وہیں رُکا ہوا ہے۔ سب کچھ اسی طرح ساکت اور جامد اور اٹل ہے۔ تھوڑی سی جزئیات یہاں وہاں سے بدل دی جائیں تو ناول میں لمحۂ موجود کی ترجمانی کی اہلیت پیدا ہو جائے گی لیکن درحقیقت اسے دورِ حاضر کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا کوئی زبردست قلابازی کھا کر سرے سے بدل جائے۔ اس کے سوا کوئی حادثہ ''لندن کی ایک رات'' کو ہم عصریت کے اس رنگ سے محروم نہیں کر سکتا جو اس پر چھایا ہوا ہے اور اگر چیزیں یکسر بدل بھی جائیں تو بھی یہ ناول اپنی انسانیت کے ناتے بامعنی رہے گا۔ اس کا اختصار منکسرانہ اور ناتواں سہی مگر اس میں کہیں نہ کہیں اتنی قوتِ مدافعت موجود ہے کہ اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہے گا۔ اس کی بنیاد میں اخلاقی سنجیدگی، یا اخلاص کہہ لیجیے، پوری طرح شامل ہے۔ کردار بہت سی توقعات کو پال رہے ہیں، ناآسودگی اور طیش کے عالم میں ہیں، امید اور خدشات کی اس ملی جلی فضا میں تناؤ کی کیفیت ہے جو ناول کے بہاؤ کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیتی۔

جس سہولت سے بیانیہ کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں وہ قابل ذکر ہے۔ ایک ہندوستانی طالب علم کے فلیٹ پر رات بھر جاری رہنے والی پارٹی کا بندوبست ہوا ہے۔ مدعو کیے جانے والوں میں سے دو کو راستے میں دکھایا گیا ہے۔ اس ترکیب سے سجاد ظہیر کو ان پر توجہ مرکوز کرنے کا موقع ابتدا ہی میں مل جاتا

ہے۔ اعظم کو جین سے محبت ہے جو کھلاڑ قسم کی لڑکی ہے۔ اعظم بہت زیادہ حاسد اور جذباتی طور پر غیر مستحکم ہے اور جین سے نباہ نہیں کر سکتا۔ اس کا ساتھی راؤ سراسر غیر جذباتی ہے۔ کھری کھری باتیں کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر جو کلبیت چھپی ہوئی ہے وہ اتنی گراں نہیں گزرتی۔ ان دونوں کے علاوہ جن کرداروں کا ذکر ہونا چاہیے وہ یہ ہیں: احسان، جس نے بائیں بازو کا ساتھ نباہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ عارف، جو وطن واپس جا کر اعلیٰ سرکاری عہدے دار بننے کے خواب دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کا میزبان نعیم، جو ملنسار اور کاہل نوجوان ہے اور بھی کئی کردار ہیں جن کی موجودگی سے منظر میں گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ سجاد ظہیر مرکزی کرداروں کو جیتا جاگتا دکھانے میں کامیاب ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی کامیابی نہیں کہ ناول کی بساط محدود ہے اور ناول نگار کرداروں کی امتیازی خصوصیات اجاگر کرنے کے لیے زیادہ چالیں نہیں چل سکتا۔

رات گئے جب پارٹی عروج پر تھی نعیم کی لینڈ لیڈی کو شور بہت ناگوار گزرا اور اس نے نعیم کو دھمکی دی کہ اگر یہ غل غپاڑا بند نہ ہوا تو اسے فلیٹ سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد پارٹی کو ختم کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ باقی سب لوگ تو چلے گئے، شیلا نامی ایک نوجوان انگریز عورت نعیم کے پاس رک گئی۔ اکیلے میں شیلا نے، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے، نعیم سے اس بنگالی ڈاکٹر کا ذکر کیا جس سے وہ سوئٹزرلینڈ میں ملی تھی اور جس پر عاشق ہو گئی تھی۔ عشق کی اس روداد میں دُور دراز کا دیہی سکون رچا ہوا ہے لیکن اس ظاہری سکون اور غم ناکی کے عنصر کے مابین زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا۔ بیانیہ میں تھوڑی سی رومانی چاشنی گھل گئی ہے۔ یہ ماجرا ناول کا نقطۂ عروج ہے۔ ناول میں ہر کوئی تھوڑا تھوڑا کھویا معلوم ہوتا ہے اور سب سے زیادہ کھوئی ہوئی بیچاری شیلا ہے۔ اس کا بنگالی محبوب، جو آزادی کی جنگ لڑنے میں سرگرم ہے، ہندوستان واپس جا چکا ہے۔ وہاں سے خاصی دیر سے شیلا کو اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ شیلا کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اب جو خبر سننے میں آئے گی وہ بدترین ہی ہوگی۔ ناول کا اختتام منضبط اور ماہرانہ ہے۔ کچھ بھی بے قرینہ نہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں انیسویں صدی کے نمائندہ روسی فکشن جیسی صفائی ستھرائی ہے۔ اس کا مزاج چیخوف سے تو نہیں ملتا، ترگنیف کے فکشن کی اداس دل کشی کچھ کچھ اس میں نظر آتی ہے۔ بہرحال، سجاد ظہیر کے اُسلوبیاتی وسائل خاصے محدود ہیں۔ ان کی نثر نپی تلی ضرور ہے اور کہیں کہیں، تیکھے پن سے، کسی پرانی کیفیت کو ازسرِ نو تازہ کرنے پر قادر ہے۔ تاہم اس میں وہ گہرائی اور صناعی نہیں جس پر آمد کا گمان ہو سکے۔ یہ نثر احتیاط اور کفایت کا احساس ہر موقع پر دلاتی ہے، جیسے آپ کوئی اعلیٰ درجے کی صحافیانہ تحریر پڑھ رہے ہوں۔ راؤ کے واہموں کو جس زبان میں بیان کیا گیا ہے وہ زوردار ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ سجاد ظہیر کا ناول آزادی کے بارے میں ہے۔ یہ سوال مدنظر ہے کہ کیا مرد اور عورت کبھی آزاد ہو سکیں گے؟ یہاں آزادی کا صرف سیاسی مفہوم ملحوظ نہیں اگرچہ بعض کرداروں کے نزدیک آزادی کا یہی پہلو سب سے مقدم ہے۔ وہ ایک آزاد ملک میں دن گزار رہے ہیں اور اپنے قول و فعل میں آزاد ہیں لیکن جس وطن سے وہ آئے ہیں وہاں ایسی کوئی آزادی نہیں۔ نعیم کہتا ہے ''ہندوستان

میں قید ہونے کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں۔ آزادی کی خواہش اس کے لیے کافی ہے۔'' اگر آپ سمندر پار تو آزاد ہوں اور وہاں آزاد نہ ہوں جہاں آپ کو آزاد ہونا چاہیے تو آپ جزوی طور پر آزاد ہیں اور جزوی، ناقص آزادی فضول، بے مصرف سی شے ہے۔ جیسا کہ شیلا کو معلوم ہے اور نعیم بھی اس بات کو محسوس کر سکتا ہے، کہیں پراٹ پتنگے انداز میں آزاد ہونا کافی نہیں۔ اہم یہ ہے کہ آپ کسی خاص مدت کے لیے، وہ تھوڑی سی سہی، اور کسی ایسے سیاق وسباق اور مقام میں آزاد ہوں، جو چھوٹا ہی سہی، مگر کلی طور پر آپ کا اپنا ہو۔

ابتدا میں کہر آلود اور سیلی سیلی رات ہے اور ہڈیوں کا گودا جما دینے والی ٹھنڈ ہے۔ جب ناول اختتام کو پہنچتا ہے تو دن کی پھیکی پھیکی روشنی دبے پاؤں کمرے میں در آتی ہے۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان میں مصنف نے ضرور یہ سمجھا ہوگا کہ رات آخر کار ختم ہونے والی ہے۔ افسوس کہ وہ کس قدر غلط سمجھے۔ غلطی جیسی بھی سہی، صورت حال سے غلط نتیجہ اخذ کرنے میں وہ تنہا نہ تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عصمت جمیل

کشور ناہید کی نظم

بیداری نسواں سے بیداری انساں تک

مخالف دھارے کے ساتھ چلنے والا ہر شخص ملامت کا نشانہ بنتا ہے اور اگر وہ روش عام ہو جائے تو پھر سرخیل بھی وہی کہلاتا ہے۔ کشور نے اپنی آپ بیتی میں جن عورتوں کو حوالہ بنایا ہے وہ حوا، لیشو دھرا، قرۃ العین طاہرہ، یونانی اساطیری دیوی Danec، سیفو اور اضا تو وا، سیمون دی بوائر اور بیٹی فرائیڈن وغیرہ ہیں یہ اپنے اپنے زمانے اور علاقے کی وہ عورتیں ہیں جنھوں نے عورت کی کمتر حیثیت پر اپنا احتجاج تاریخ میں ریکارڈ کروایا۔

برصغیر کی عورت کے لیے بہت عرصے تک وقت رُکا رہا۔ حتیٰ کہ انگریزوں کی آمد نے مغربی تعلیم وتہذیب تک راستہ بنایا۔ سروجنی نائیڈو، عطیہ فیضی، ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر آئیڈیل بنیں سروجنی نائیڈو اور عطیہ فیضی جیسی خواتین نے سیاسی وسماجی سطح پر خواتین کی رہنمائی کی جب کہ ڈاکٹر رشید جہاں اور پھر عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں ریت وروایت کے نام پر عورت کے کمزور ہونے کا بھانڈا پھوڑا اور ایک نئی اخلاقیات ترتیب دینے کی کوشش کی، جس کی بنیاد سچائی پر ہو۔ عورت کی نفسی ونفسیاتی حالتوں کی عکاسی ہو اس کے مسائل اس کی ضرورتوں اس کی مجبوریوں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بیان ہو شاعری میں یہ رویہ ذرا دیر سے آیا۔

اس رویے کی نمائندگی کرنے والی شاعرات میں کشور ناہید نے ۷۰ کی دہائی سے لے کر آج تک اپنے عہد کی عورت کو بیان کیا۔ کشور کی نظموں میں آج تک کا سارا افسانوی ادب مجسم ہوتا نظر آتا ہے لیکن سچ کہنے والوں کو ملامتوں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے کشور کو بھی اس کا احساس ہے کہ اس سے کیا قصور سرزد ہوا ہے۔ ''میں نے بھی سارے گھروں کے صحنوں میں جھانکا ہے اور شاید کہیں یہ کہہ بھی دیا ہے 'بادشاہ ننگا ہے'۔'' (۱)

کشور تک آتے آتے عورتوں کے حوالے سے زمانہ بڑی تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ کشور کی آپ بیتی رشاعری بھی ان تبدیلیوں کی گواہی دیتی ہے۔ ''یہ بیس برس پہلے کی بات ہے میں آج یہاں اٹلی میں بیٹھی اپنی کتھا لکھ رہی ہوں۔ سپین میں میری ایک بہو شارلٹس اور امریکہ میں دوسری بہو سکرٹ پہنتی ہے۔ میری بھانجیاں امریکہ میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں اور میری ماں ڈولی میں بیٹھ کر سفر کرتی تھی۔۔۔ پردے کا یہ عالم تھا کہ ہماری نانی اور ایک عمر تک ہماری اماں بھی اپنے دامادوں کے سامنے نہیں آتی تھیں

ڈولی دوباری میں رکھی جاتی تھی اس میں ایک پتھر جاتا اماں اس میں بیٹھتیں پھر کہاروں کو اندر بلایا جاتا وہ ڈولی نانی اماں کے گھر اسی طرح دوباری میں رکھتے اور یوں مختصر سفر بھی طے ہوتا۔'' (۲)

کشور نے روایت سے بغاوت کی اور مردود ٹھہری۔ ''میرے باپ نے کہا۔ میرے گھر مت آؤ۔ تم نے غیر ذات کے لڑکے سے شادی کی ہے، برقعہ اتارا ہے، نوکری کرتی ہو، ایم اے کیا ہے۔'' (۳)

کشور نے شاعری کو سہارا بنالیا۔ ''عورت بیوی اور ماں بن کر جینے سے زیادہ مزا مجھے شاعری میں مل جاتا ہے میرے ذہن کا اُبال خلجان اور تشنج بہت کچھ شاعری ہی تو خارج کرتی ہے۔'' (۴) لیکن صرف شاعری ہی اس کی پہچان نہیں کشور نے بہت کام کیا بقول جاوید شاہین: ''ایک تو وہ سب میں بلند ترین مقام رکھتی ہے دوسری طرف وہ عملی زندگی اور کاروبارِ حیات میں بھی اتنا ہی اونچا اُڑنا چاہتی ہے یہ دو متضاد خواہشیں اس کے اندر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سفر کرتی ہیں۔'' (۵)

کشور کی ذاتی زندگی اور کشور کے آدرش اس کی شاعری میں پوری شدومد سے موجود ہیں کشور نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں اس نے کسی حد تک روایت کا ساتھ نبھایا لیکن کشور کی نظم نے اس کی ذہنی واردات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ ''لب گویا'' کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں نظمیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ ''بے نام مسافت''، ''گلیاں دھوپ دروازے''، ''ملامتوں کے درمیان''، ''سیاہ ہاشیے میں گلابی رنگ'' اور ''میں پہلے جنم میں رات تھی'' میں اس کی نظمیں اپنے اظہار کی بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ کشور کی ان نظموں میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل انداز میں شاعرانہ بصیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی وحدتِ تاثر ان کی طبع سخن کا نظم کی طرف رجحان کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ بعد میں انہوں نے نظم کی دنیا میں جذبے کی صداقت اور حقیقت کے برملا اظہار سے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔

کشور نے اپنی نظم کو حیات کے کسی ایک پہلو تک محدود رکھنے کی بجائے حیات و کائنات کی متنوع کیفیات سے آراستہ کیا ہے۔ ان کی نظم میں ذاتی احساس کی ترجمانی سے لے کر عہد حاضر کے تمام معاشرتی و سیاسی مسائل کو سمیٹا گیا ہے اور ان مسائل پر اہل اختیار کی بے حسی پر انتہائی جرأت مندی اور بے باکی سے احتجاج بھی کیا ہے۔

ان کی شاعری میں ان کے گردوپیش کا ماحول بھرپور انداز میں موجود ہے جس میں انہوں نے سانس لینا سیکھا ہے۔ انہوں نے معاشرے کی تمام اقدار و افکار کو اپنی شاعری کے کینوس پر مقید کرنے کے ساتھ ساتھ پابندیوں میں جکڑے ہوئے معاشرے کے انسانی جذبات اور بے بسی و نارسائی کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار ارتقا کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا کندن ہو چکا ہے۔ کشور نے محبت کے روایتی موضوع کو اپنی تمام تر دلکشی اور رعنائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں کے انسان کو آج بھی ایسی محبت کی ضرورت ہے جس میں جذبے کی سچائی ہو، شدت ہو۔ یہ انسان حقیقی محبت کو فوقیت دیتا ہے اور

خیال و خواب اور تصورات پر مبنی محبت کو تسلیم نہیں کرتا کشور اپنی نظم ''القاب'' میں لکھتی ہیں:

اگر تم میری جانب آؤ تو
اپنی مہربانی کے چراغ ساتھ لانا
میں محبتوں کی خوشبو اپنے ساتھ بچالائی ہوں
اور تمہاری منتظر ہوں

محبت کے اظہار کا بھرپور رنگ کشور ناہید کی نظم ''یوسف کا مران'' میں بھی ملتا ہے نظم ذاتی واردات ہونے کے باوجود محبت اور وارفتگی کے والہانہ پن کو ظاہر کرتی ہے جس میں زمانے کی طرف سے محبت کی راہ میں لگائی جانے والی قدغنیں اجتماعی حالات کا اظہار بھی کرتی ہیں کشور سمجھتی ہیں کہ مرد و عورت کا تعلق ازلی و ابدی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کو پہچاننا چاہیے ایک دوسرے کی قدر کرنی چاہیے ان کی آپس کی جنگ سماج کی ایک چال ہے ''ازل سنیاس'' میں کہتی ہیں:

بادلوں سے اوپر جا کر بھی
تم میرے ماتھے پر قدم جما کر رکھنا چاہتے ہو
آسمان میں اُڑتے کبوتروں کو
میری آزادی کا آئینہ سمجھ کر
ہاتھ میں بندوق اُٹھا لیتے ہو
رات کے آخری پہر میں
ڈوبتے ستاروں کو دیکھ کر
تمہاری تمنا ہوتی ہے کہ
میرا وجود بھی یونہی کہیں چھپ جائے
حالاں کہ تم جانتے ہو
زمین کی سمت تمہیں واپس آنا ہے
اور میرے ساتھ اس زمین پر
اس وقت تک رہنا ہے
جب تک ہم دونوں کے وجود
کہیں چھپ نہیں جاتے

لیکن جب عورت کی اہمیت سے انکار کیا جاتا ہے اسے کم تر مخلوق قرار دیا جاتا ہے تو کشور کے تن بدن میں آگ لگ دی جاتی ہے۔

موجود سے انکار بھی

تو قتل کے مترادف ہوتا ہے
میرا جی کرتا ہے
وہ جو سب میرے قاتل ہیں
میں انہیں ہوا کی طرح نگل جاؤں

عورت جو بچے کی خالق ہے اس کے وجود سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے حقوق نسواں کی ایک جرمن خاتون نے کہا تھا کہ ''میری تاریخ کی کتابیں جھوٹ بولتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ میرا وجود نہیں تھا۔ تاریخ میں عورت کا وجود تو ہے مگر اس کا وہ وجود ہے جو مرد نے تشکیل دیا ہے کیونکہ ہماری پوری تاریخ مردوں کی تاریخ ہے عورتوں کی نہیں اس تاریخ کا جو خاکہ اور فریم ورک ہے اس میں عورت کے لیے کوئی بھی کشش نہیں جو عورت تاریخ کے صفحات پر ابھرتی ہے اس کا کردار اور عمل مرد کے تابع ہوتا ہے۔'' (٦)

انقلاب جمالیات سے تعلق رکھتا ہے اور تمام انقلابی سوچ رکھنے والے معاشرے کی بدہیئتوں کو خوب صورتی میں بدلنا چاہتے ہیں اپنے ماحول میں خوب صورت قدروں کے پروان چڑھنے کی آرزو ناہید کو بھی ہے وہ اپنی نظموں میں اس شعور کو وسعت دیتی نظر آتی ہیں کہ ہمت اور عقل سے اپنے معاشرے میں تمام تر بدہیئتوں کو ختم کرنے سے حسن پیدا کیا جا سکتا ہے جس کے لیے خلوص، لگن اور چاہت کے علاوہ جرات مندی کی بھی ضرورت ہے۔ وہ بار بار نظام کہنہ کو بدلنے کی ترغیب کے ساتھ لوگوں کو دعوت عمل دیتی ہیں کہ ظلم اور استحصال پر قائم اس نظام کو اپنے فکر و عمل کی بدولت بدل سکتے ہیں اور ایسا نظام قائم کر سکتے ہیں جہاں انصاف امن اور خوش حالی کے چراغ روشن ہوں ذرائع پیداوار کی مساویانہ تقسیم ہو۔ تمام انسانوں کو سوچنے کی آزادی ہو۔ وہ سمجھتی ہیں ایک دن آئے گا جب ان کا یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لے گا۔

''سلامت گہہ خواب کو روند ڈالو'' میں کہتی ہیں:

وہ دیوار گرتی نظر آ رہی ہے
صبا نے کہا پھول کھلتی ہوئی رُت میں سونا دیوانگی ہے
نظر تو اُٹھاؤ یہ دیوار و در پہ اُگے سبز پتوں کی نس پر نئے پتے

اور پھر یہ باور کراتی ہیں کہ اگر ہمت ہاری تو منزل مزید دُور ہو جائے گی۔ کہتی ہیں:

اندھیروں کی تائید تقدیس خون کی علامت ہیں
شوق و عزم و اُمید کی سرخ جھنڈی کے فتوے کی حسرت میں
تسلیم ایذا پہ مائل کرو گے
تو آنکھوں کے حلقے تمہاری رفاقت کا نوحہ لکھیں گے۔

پھر اچھے دنوں کی نوید دیتے ہوئے کہتی ہیں:

یہ شب جو زمانے سے ہم پر

سراسیمگی اور اندھیرے کا جادو چلائے ہوئے ہے
یہ شب جو ہمیں آس کی ڈوریوں سے تڑا کر
نئے جال میں دلنشیں طور پر قید کرتی رہی ہے
یہ شب جو ہر ایک گھر کے دالان میں
مشعلوں کی زبان کی دشمن رہی ہے
یہ شب جو کل اس زمین کے جیالوں کی
آنکھوں کا پردہ رہی ہے پناہ مانگتی ہے ہراساں ہوتی ہے
یہ کیا راز ہے
کیا یہ شب کے بڑھاپے کا آغاز ہے؟

لیکن اس کے باوجود کشور کو یہ احساس ہے کہ صدیوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے لوگ اس گرداب میں مزید پھنستے جا رہے ہیں آزادی کے لیے نہ تو وہ تیز رفتار جدوجہد کر رہے ہیں اور نہ فکری طور پر یہ ان کی مستقل بے حسی کا رونا رو رہی ہیں کہ لوگ آنکھیں بند کر کے دقیانوسی اور مردہ خیالات کی پیروی میں جہالت کی جانب قدم اُٹھائے جا رہے ہیں انہیں اپنے حال کا ادراک ہی نہیں ہے۔

ہم کہن سالہ شب غم کے مجاور اب تک
ہیں اساطیری دیرینہ روایات کا عکس
ہم میں وہ جرأت بے تاب کہاں ہے کہ ملے
خواب میں عکس رُخ یار کا لطف (وحشت گہہ شوق)

اس روایات کی اندھی پاسداری میں ترقی کے تمام رستوں کو مسدود کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہیں:

ہم روایات کی کہنہ صدیوں کے پربت تلے
وہ گھنے سبز جنگل ہیں جو
بے پتہ شاخ در شاخ تابندگی (روایت نہ ٹوٹے)

کشور کا دُکھ عمل سے دوری ہے۔ وہ جھنجھلا کر طنز کی تلوار چلاتی رہتی ہیں۔

ہمیں
درخت چلتے ہوئے اور چھاؤں ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے
نہ کہیں قیام نہ کوئی فاصلہ
کہ جس کو طے کریں
تو خشک سالی کا موسم ختم ہو (پر کٹے پرندے)

کشور ناہید کا سارا فن اس بات کا مشاہدہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کی علم بردار ہونے کے ساتھ ساتھ عورت کے حقوق کی بھی زبردست داعی اور مبلغ ہیں اور ان میں اپنے وجود کی شناخت اور بیداری پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہیں اس کے لیے انہوں نے جہاں اپنے علم کو اپنے نظریے کے تابع رکھنے کی کوشش کی ہے وہاں وہ اپنی عملی زندگی سے بھی عورتوں میں بیداری و ادراک پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں اس تحریک کے لیے انہیں ان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جن سے ہمارے معاشرے کی عورت عمومی طور پر دوچار ہے۔

میں کہ عورت ہوں
میرے نام سے غیرت منسوب
مجھ سے گھر بار کی عزت
میری خواہش مٹی
میری چاہت حیلہ
میرے خوابوں کی پناہ گاہ
فقط خاک ہی خاک (اپنے خون کا جوش)

کشور ناہید نے اپنی نظموں میں اس مجبور و مقہور صنف پر ہونے والے مظالم کی بہت دردانگیز تصویریں بنائی ہیں کہ بے پناہ مصائب کے باوجود عورت اپنے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کے ساتھ معاشرے کے ظلم و ستم کے سامنے ڈٹی ہوئی ہے۔ مرد اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے اس کی تمام آرزوؤں اور اُمنگوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے وہ عورت کو گھاس سے تشبیہ دیتی ہیں کہ اگر عورت ذرا بھی اپنے حقوق پہچان لے تو ہم رسم و رواج اور مذہب کے اسلحہ خانوں سے اس کے خلاف دشنام طرازی فتویٰ گیری کی ایک بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے تاکہ اس کا راستہ روکا جا سکے۔

گھاس بھی مجھ جیسی ہے
ذرا سر اُٹھانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اسے مخمل بنانے کا سودا لیے
ہموار کرتی رہتی ہے

اسی طرح نظم ''نیلام گھر'' میں عورت کی بے بسی کو اُجاگر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ حق مہر کے عوض عورت کی پوری زندگی کو اپنی ملکیت سمجھ لیا جاتا ہے مرد خود کو اس بات کا حق دار سمجھتا ہے کہ عورت کی زندگی کو جس طرح چاہے ڈھالے اور عورت ساری عمر اس کے اشاروں پر ناچتی رہے۔ معمولی سی گھریلو غلطی پر وہ اسے جسمانی ایذا پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

میرے منہ پر طمانچہ مار کر
تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان
پھولی ہوئی روئی کی طرح
میرے منہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں
تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے (نیلام گھر)

کشور سمجھتی ہیں کہ مرد عورت کو ایک کنیز سے زیادہ نہیں سمجھتا کیونکہ وہ خاندان کو معاشی سہارا دیتا ہے جب کہ عورت کنیزوں کی طرح گھر میں کام کرتی ہے حالاں کہ اس کا یہ کام انتہائی محنت اور ذمہ داری کا ہے۔ سارے دن کی محنت کے بعد مادی قدر کی صورت میں کوئی معاوضہ تو درکنار اسے تسلی کے دو بول بھی نہیں ملتے بلکہ اس کے کام میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر اسے بے عزت کیا جاتا ہے اس لیے وہ نوعمر لڑکیوں کو بتاتی ہیں کہ ان کی زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر گزرنے کے لیے ہے جب کہ مرد کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہیں۔

پھر بھی کماؤ پوت کے لیے
کنیزوں کی طویل قطار سجتی ہے
جسے چاہو اپنی سزا کے لیے منتخب کر لو
اور یوں باقی عمر
اے کالج کے لیے بس کا انتظار کرنے والی لڑکیو
دھواں چھوڑتی بسوں کی طرح دھکے کھا کھا کر گزار دو

کشور چاہتی ہیں کہ عورت کا کوئی مستقل مقام ہو، اُسے تسلیم کیا جائے، دنیا کے طاقتور طبقوں نے اپنی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے لیے اعلیٰ مقام چن لیے ہیں وہ جو انسانی زندگی کا بنیادی جزو ہے اس کا مقام کہاں ہے۔

آسمان سے رزق دینے والے کو خدا
اور زمین پر رزق دینے والے کو مجازی خدا کہنے والوں نے
مجھے یہ منطق نہیں سکھائی
کہ سردیوں میں آگ کے گرد ناچنے والوں کی
آنکھوں کو رزق دینے والی کو
کس زمانے کا خدا کہا جائے گا (آگ کا رقص)

کشور عہد نو کی عورت کی نئی تذلیل کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ایک طرف

عورت کو مذہب اور رسوم کی چکی میں پیسا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ایک طبقہ عورت کی تذلیل کرنے کے لیے اسے ماڈل بنا کر اشتہاری فلموں کی زینت بنا رہا ہے جو عورت کے اصل روپ کو مسخ کر رہا ہے جس پر احتجاج ضروری ہے۔

موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
اور یہ ایمان کی دوسری شرط ہے کہ برائی کو ہاتھ سے نہیں روک سکتے
تو زبان سے روکو
بولنا ہماری ضرورت ہے
چاہے زمین میں منہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے
میری بے گہنی زمین میں منہ دے کر
اپنی صفائی میں پیش کر رہی ہے (تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت)

ڈاکٹر جمیل جالبی، کشور ناہید کے اس رویے کے بارے میں کہتے ہیں: ''یہ کشور ناہید کی شاعری کی عورت ایک ایسی عورت سے ہے جس کی اپنی انا اور اپنی شخصیت ہے اور جسے قدم قدم پر مرد کی انا اور دوسرے رشتوں سے لڑائی لڑنا پڑتی ہے ان کی شاعری اپنی بوسیدہ بے معنی رشتوں سے جنگ کی شاعری ہے یہ وہ رشتے ہیں جو فنکار کو زخم کرتے ہیں اس کی انا سے ٹکراتے ہیں اس کے وجود کو اندر سے توڑتے پھوڑتے ہیں۔'' (۷)

اسی طرح ''ملامتوں کے درمیان'' کی طویل نظم ''اسیں بوریاں وے لوکو'' عورت کی مجبوری اور بے بسی کی داستان ہے جس میں اس کے جذبات کو مرد کے ہاتھوں کچلتا ہوا دکھایا گیا ہے اور عورت کو ایسی تنہا مخلوق دکھایا گیا ہے جس کے لیے جا بجا مظالم منہ کھولے کھڑے ہیں اور وہ تن تنہا اس جبر کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے جب کہ تمام رشتے ناطے استحصال کی ہی مختلف شکلیں ہیں اسی طرح اپنی نظم روزنامچہ میں بڑی خوب صورتی سے عورت کے ساتھ مرد کے معاشرے کے غیر مساویانہ سلوک کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اگر عورت ذرا بھی لب ہلائے تو معاشرے کے ٹھیکیدار اس پر بے حیا، بدچلن اور مغرب زدہ کا الزام لگا دیتے ہیں۔

میرے ہر آج کو گزشتہ بنانے والوں نے اپنے ناموں کے سامنے اوصاف
اور میرے نام کے سامنے دشنام لکھی ہے
میری تاریخ کو زنجیر پہنانے والوں نے
میرے گھر کے سامنے سلاخیں
اور اپنے گھر کے سامنے
عشق پیچاں کی بیل سجالی ہے (روزنامچہ)

کشور کی نظموں کی ایک اور جہت ورکنگ وومن کے مسائل کی ہے کہ انہیں کس طرح دفتروں میں منافقانہ رویے اختیار کرتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور لوگوں کی طرح طرح کی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں کہیں ان کے ہونٹوں پر فحش فقرے ہوتے ہیں اور کہیں نظروں میں ہوس کے گہرے سائے عورتوں کو اپنی ذات پر جبر کر کے یہ صورت حال برداشت کرنا پڑتی ہے۔

بکری ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے
اور میں صبح ہونے کا
کہ میں روز دفتری میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھوٹ بولنے کے لیے
صرف یہی میری قیمت ہے

اس طرح عورت کی جذباتی فکری اور جسمانی پامالی اور احساس سے پیدا ہونے والے دکھ درد کشور ناہید کا تخلیقی تجربہ بن کر اس کی شاعری میں اظہار پائے تو نظم کے اندر چھپے ہوئے تجربے کی سچائی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ورکنگ وومن کے جذبات و احساسات کا بیان بھی کشور کا ذاتی تجربہ ہے۔ عورتوں کے اس طبقے کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور کشور کے مسائل عورتوں کے ایک بڑے طبقے کے مسائل بنتے جا رہے ہیں یہ شاعری عورت کے ذہن کی ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے کہ مدعی اگر چست ہو تو زمانے کی عدالت کو اپنے قوانین بدلنے پڑتے ہیں۔

میری آواز میرے شہر کی آواز ہے
میری آواز میری نسل کی آواز ہے
میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی
کیا سمجھ کے تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو

عورت ایک نئے مرد کو دنیا میں لانے کا ذریعہ بنتی ہے نسل انسانی کا انحصار عورت پر ہی ہے اس لیے سب سے پُرخلوص روپ ماں کا ہے ایک ماں کو ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ایسے پُرامن ماحول میں پرورش پائے جہاں معاشرہ خوش حال ہو صحت مند قدریں پروان چڑھ رہی ہوں اور اس کی اولاد مناسب تعلیم و تربیت حاصل کر کے بہترین شہری بن سکے لیکن جب معاشرہ عورت کے لیے ہی اپنے اندر نفرت کی بنیاد رکھتا ہو اور استحصال کے تمام روایتی ہتھیاروں سے عورت کے خلاف منافرت کی لہریں پیدا کی جا رہی ہوں تو اسے مرد کے خلاف مزاحمت کرنا پڑتی ہے اور اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کرنا پڑتا ہے وہ مرد کے اس معاشرے میں نئے مرد کی آمد سے پہلے یقین دہانی چاہتی ہے۔

میری پیدائش سے پہلے مجھے تسلی دو
مذہب کو میرے کانوں میں بند نہیں کیا جائے گا

میری ماں بیٹی کی پیدائش پر در بدر نہیں ہوگی
انسانیت کی دیواریں مجھے چن دینے کے لیے نہیں
مجھے تحفظ دینے کے لیے ایستادہ ہوں گی
میرا خون بہانے کے لیے
اور میرا لباس بے لباسی کے لیے
حوالہ نہیں ہوگا

کشور کے شعری سفر کا ارتقائی جائزہ لیا جائے تو ابتدائی زمانے سے ہی جب جنس محبت اور تحیر اس کے کلام پر غالب تھا اس کے اندر چھپی ناراض اور سرکش عورت کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں آہستہ آہستہ انہوں نے اس نظام کے ذمہ داروں کو پہچان کر ان کے خلاف آواز اُٹھائی لیکن ان کی جنگ کبھی بھی فرد واحد کی جنگ نہیں رہی بلکہ وہ اپنے معاشرے کی سبھی ستم رسیدہ عورتوں کی نمائندگی کرتی ہیں رفتہ رفتہ یہ احتجاج تیسری دنیا کی ساری خواتین کی آواز بن جاتا ہے۔ بقول انتظار حسین ''کشور ناہید عورتوں تیسری دنیا کی سب عورتوں کے دکھوں اور پریشانیوں کو سمیٹنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔''(۸)

میں کبھی غم تھی مجسم غم
بوسنیا میں روتی بلکتی عورتوں کو
دیکھنے سے پہلے
میں کبھی عورت تھی
مسلسل رونے سے پاگل ہوئی بے لباس
بے پرواہ، بے حواس، پتھرائی ہوئی عورتوں کو
دیکھنے سے پہلے
میں کبھی بھوک تھی
روانڈا میں اپنا ہی بول و براز کھاتی
صومالیہ میں اونٹوں کی کھال بھنبھوڑتی انسانیت کو
دیکھنے سے پہلے (یورپ میں نہ پگھلنے والی نظم)

''ہم گنہگار عورتیں'' میں کہتی ہیں کہ آج بھی جسموں کی منڈیوں میں عورت کا وجود بک رہا ہے خریدار مرد ہے لیکن تمام تر دشنام طرازیوں کی زد میں عورت ہے جب کہ اس کھیل کا بڑا کردار ہونے کے باوجود مرد عزت دار اور غیرت مند کہلا رہا ہے غیرت کے نام پر قتل کرتا ہے اور اگر عورت ان مظالم کے خلاف آواز اُٹھاتی ہے تو سامراج کے محافظ اپنے تمام تر وسائل کی مدد سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیا بت امتیاز ٹھہریں
وہ داور اہل ساز ٹھہریں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اُٹھانے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملی ہیں
ہر ایک دہلیز پر سزاؤں کی داستانیں رکھی ملی ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملی ہیں

لیکن عورت اپنی اندرونی طاقت سے ان تمام معاشرتی قدغنوں کے باوجود ظلم کا مقابلہ کر رہی ہے۔

یہ گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں

کشور ناہید کی زبردست خواہش ہے کہ عورتیں فرسودہ خیالات سے باہر نکل کر معاشرے میں فرد کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوائیں اور وہ تمام حقوق حاصل کریں جو ایک مرد کو حاصل ہیں جو بنیادی انسانی حقوق کہلاتے ہیں وہ جہاں معاشرتی استحصال کے خلاف جنگ کریں وہاں مرد کی برتری کے خلاف بھی مزاحمتی رویہ اختیار کریں۔

بیٹی، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنی خاطر بھی تو جیو

اس طرح کے مشورے دے کر کشور ناہید بیداری نسواں کی تحریک کی علمبردار بن جاتی ہیں لیکن کیا اسے فیمنزم کی ماری ایک عورت سمجھا جائے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں: ''کشور کے اکثر نقاد اسے روایتی مرد معاشرے کے خلاف ایک باغی اور سرکش شاعرہ قرار دیتے ہیں جو مظلوم عورت کی جنگ لڑ رہی ہے کیا کشور کی شاعری صرف روایتی جبر و بالادستی کے خلاف ایک موثر آواز تک ہی محدود ہے یا وہ اس سے

بھی آگے نکل کر پورے استبداری معاشرے کو چیلنج کر رہی ہے اس میں شک نہیں کہ عورت ہونے کے ناطے اس کا فوری اور قریبی ہدف مرد کی روایتی بالادستی کا وہ نظام ہے جس میں ہماری عورت برسوں سے جکڑی ہوئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کشور کی شاعری کا دائرہ صرف نسوانی سرکشی تک ہی محدود نہیں بلکہ استحصال کے پورے معاشرے کو تبدیل کرنے اور طبقاتی نظام کی جڑوں کو ہلانے تک پھیلا ہوا ہے۔'' (۹)

اور انہیں یہ بھی یقین ہے کہ ان کی مزاحمت سے سماجی رویوں میں تبدیلی آئے گی اور عورت کو وہ تمام حقوق مل جائیں گے جو مرد کی برتری کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

میرے اندر کے اندھیرے کے خلاف
لڑنے کا عمل تھا
مجھے بار بار یہ یقین اس ضد پر اکساتا تھا
کہ کسی سرزمین پر کسی جگہ تو
خوشگوار صبح طلوع ہو رہی ہوگی

یہ خوشگوار صبح وہ اپنے لیے نہیں اپنی صنف کے لیے مانگتی ہے۔

ہے میری میا
آج بہت دروازوں پر لٹکتی تختی پہ
میرا نام لکھا ہے
میری بڑائی میرے منصب میری خاطر
سب کے ہاتھ میں پھول، علم ہیں
یہ کہوے ہیں اور لکھے ہیں
میری بڑائی میرے منصب میری خاطر
صف آرا ہیں
دروازوں کی تختی والے ملکوں ملکوں جاوے ہیں
اور کہوے ہیں
جگ کی آدھی آبادی کو
کل جگ وے کے، پیچھے چھوڑ کے
کہاں رہو گے
سب کہوے ہیں
سب سن لے ہیں

کشور ناہید معاشرے کی منافقت اور ریاکاری کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اظہار رائے کی

پابندیوں اور فرسودہ روایات کے خلاف بھی بہت دلیری کے ساتھ آواز اُٹھاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمارے سماج میں ہر وہ آواز جو حقوق کا نعرہ مستانہ بلند کرتی ہے سماجی رسوم و قیود کی نظر ہو جاتی ہے اسے دبانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آواز پھر بھی خاموش نہ ہو تو اسے مٹا دیا جاتا ہے لیکن اس کی بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔

آواز آزاد ہو تو نعرہ منصور
اور گھٹ جائے تو حسن ناصر بن جاتی ہے

اسی طرح وہ ایک نظم ''تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت'' میں حق کہنے والوں پر تعزیریں عائد کرنے کے بعد پیدا ہونے والے خوف کے ماحول کا بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ قاضی شہر نے حق پرستوں کو سخت سزائیں دے کر پورے ماحول کو سہما دیا ہے اور سب کو قوت گویائی سے محروم کر دیا ہے اور اگر کوئی بولنے والا باقی رہ گیا ہے تو اس کو بھی اپنی جان اور عزت کے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔

وہ ایسے سماجی رویوں کے خلاف نوحہ کناں ہیں جہاں انسان سے انسان کی محبت کو گناہ اور شر سمجھا جاتا ہے حالانکہ انسانوں سے محبت کرنا ان کی تعظیم کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے لیکن یہاں بھی معاشرتی جکڑ بندیاں اپنے فولادی ہاتھ لیے آن پہنچتی ہیں۔

کشور کو نام نہاد محبِّ وطن کہلانے سے نفرت ہے لیکن ان کے دل میں اپنے وطن کی دھرتی سے لازوال محبت موجود ہے جس کا اظہار کئی نظموں میں مل جاتا ہے دراصل جہاں انہوں نے سماجی و معاشرتی پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا وہاں یہ خواہش بھی ہے کہ ان کے وطن میں آزادیٔ اظہار رائے ہو ایسا مثالی معاشرہ تشکیل پائے جس میں ایسی خوشحالی اور خواندگی ہو جس سے سماجی برائیاں ختم ہو جائیں۔

وہ یہ سوچ بھی رکھتی ہیں کہ اگر معاشرے میں عورتوں کو مساوی حقوق میسر آ جائیں تو وہ بحیثیت فرد ملک و قوم کی ترقی میں بہترین کردار ادا کر سکتی ہیں انہوں نے اپنی نظموں میں 'ماں' کو وطن کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اس لیے وہ اپنے وطن میں رہنے والے ان عناصر کی نشان دہی کرنے کے درپے ہیں جو وطن میں اپنی ناپاک خواہشوں کی تکمیل کے شوق میں بدصورتیوں کو جنم دے رہے ہیں اور ملک کی مٹی کا سودا کر رہے ہیں۔ ''زخمی پرندے کی چیخ'' میں وہ وطن کو ماں کہہ کر پکارتے ہوئے اس کی عزت برباد کرنے والوں کے خلاف سراپا احتجاج ہیں جو وطن کی آبرو کو بڑے ملک کے پاس رہن رکھ کر بہادری اور غیرت مندی کی داستانیں رقم کر رہے ہیں۔

دیکھ ری ماں
تیری عزتوں سے کھیلنے کا نام
ہے اگر بہادری تو ہمیں بزدلی قبول
تیرے کھیتوں کو بیچنے کا نام

ہے اگر تو نگری تو ہمیں عسرتی قبول

اسی طرح ''سرد ملکوں کے آقاؤں کے نام'' سامراجی قوتوں کے خلاف بھرپور تازیانہ ہے۔ ان کی نظم ''ہڈ بیتی'' بھی وطن سے محبت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

کشور ناہید اپنی نظم ''التماس'' میں انتظامیہ اور بالادست طبقے کے فیوڈل کلچر کے خلاف بھی مزاحمت کرتی نظر آتی ہیں جو انسانی آزادیوں کا گلا گھونٹ رہا ہے اس فیوڈل کلچر کے خلاف نفرت ان کی انسان دوستی ہی کی وجہ سے ہے یہ فیوڈل کلچر مذہبی رنگ میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کشور سمجھتی ہیں کہ اقتدار اور مذہب کا گٹھ جوڑ انسانی آزادیوں کی راہ روک دیتا ہے۔ ''اے میری قوم میری بنتی سُن'' میں مولویوں کے عورت کے متعلق رویے کے بارے میں کہتی ہیں:

انہیں عورت سے نفرت ہے
گویا اپنی ماں اپنی بیٹی سے نفرت ہے
وہ عورت کی ہر شکل میں شہوت دیکھتے ہیں
اور یوں اپنے خوابوں کو آراستہ کرتے ہیں
دنیا پہ کوئی مصیبت آجائے
وہ نہیں بولیں گے
سارے ملک کے سارے افسر
راشی شرابی اور بدکردار ہو جائیں
وہ نہیں بولیں گے
ہر ہر قدم پر گلے کاٹے جائیں
لوگ خریدے اور بیچے جائیں
وہ نہیں بولیں گے
ہاں کوئی عورت ہاتھ میں علم لے کے نکلے
فوراً بولیں گے
فوراً خارج کر دیں گے دائرہ اسلام سے
زندگی کے ہر انعام سے

کشور نے اپنی نظم اور غزل دونوں میں اپنے مخصوص فکری رویے کو فوقیت دی ہے۔ کشور کی نظم میں ایک مربوط فکری رویہ موجود ہے جو پختگی کی جانب رواں دواں ہے۔ فکری سطح پر کشور کی نظم ایک باشعور جرات مند اور بے باک رویے کی حامل ہے۔ کشور ناہید نے اپنے منفرد اُسلوب میں زبان و بیان کے نئے فکری سانچوں کو بھی ہم آہنگ کیا ہے۔ کشور نے اپنے سماج کی منافقت اور ریاکاری پر بھی کھل کر اظہار کیا

ہے۔ سماج کے کرتا دھرتا اس ملک کے غریبوں کی قسمت بدلنے کا عزم کرتے ہیں لیکن پھر یہی راہنما ان غریبوں کی قسمت کا سودا اور کہیں کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس لوگوں کو ساتھ ملانے کے گُر ہیں جنہیں آزما کر ان پر حکمرانی کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے سجا رکھے ہیں جو موقع و محل کی نسبت سے تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ نظم ''تقریر نمبر ۲۷'' اسی صورت کو بے نقاب کرتی ہے۔

''خود احتسابی'' میں بھی انہوں نے انہی راہنماؤں کے کارناموں کو بیان کیا ہے جو قوم کو اپنی ذاتی رنجشوں کی بھینٹ چڑھا کر خونریز وحشیوں کی نذر کر دیتے ہیں اور قوم کے افراد ایک دوسرے کے خلاف بندوقیں اُٹھا کر برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ اس خونریزی سے ہر ملک میں غربت، جہالت، بے روزگاری اور تھانوں میں ضمانتوں کی ضرورت پڑتی ہے جس کی آڑ لے کر یہ راہنما اپنی دوکانداری چمکاتے ہیں۔

جب آخری سیاست دان آخری آدمی کو بھی
قتل کر دے گا
جب آخری بچہ بھی چاول کے ایک دانے کی
تلاش میں بلک بلک کر مر جائے گا
جب آخری قطرہ خون بھی
مادرِ وطن کے تحفظ میں صرف ہو جائے گا
جب دعا کا آخری حرف بھی ختم ہو جائے گا
جب آخری گولی بھی سینے کے پار اُتر جائے گی
میں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں: ''عورت اس کے ہاں استحصال زدگی کا ایک علامتی پیکر ہے جس کے ذریعہ وہ بیک وقت مرد کی روایتی بالادستی اور پورے طبقاتی نظام کی جڑوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور یہ جو کسی نے کہا کہ جدید سامراج اس وقت تک آرٹ اور کلچر کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ اس کی جڑوں پر حملہ آور نہ ہو اور چونکہ کشور کی شاعری براہ راست جڑوں پر حملہ کرتی ہے اس لیے دائیں اور بائیں بازو کے وہ تمام دانشور جو طبقاتی نظام کے خلاف بھی ہیں اور آزادی نسواں کی باتیں بھی کرتے ہیں اس کے خلاف ہیں۔'' (۱۰)

انہوں نے آزاد اور نثری نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثری نظموں میں مفاہم کھل کر بیان ہوتے نظر آتے ہیں آزاد نظموں میں شعری آہنگ شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی نظموں کا لہجہ جارحانہ بے باکی لیے ہوئے ہے جو اُن کا عام رویہ ہے مگر وہ سنسنی خیزی سے فضا سازی نہیں کرتیں بلکہ موضوع کے جذباتی اور حسی تلازمات کو اس طرح تمناؤں کے سلسلے میں پروتی ہیں کہ ایک طرف نظم میں

وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف نظم ایک نامیاتی وحدت میں ڈھل جاتی ہے۔ کہیں داخلی خود کلامی کہیں ہم کلامی کہیں ڈرامائی مخاطبت اور کہیں مکالمے کے ذریعے ان کی نظمیں قاری کو احساس دلاتی ہیں کہ ان کے تجربے مشاہدات اور مطالعہ کی حدود بہت وسیع ہیں اور وہ ہیت اور تکنیک کے ان امکانات سے بھی آشنا ہیں جنہوں نے مغربی شاعری کو تخلیقی معراج سے ہم کنار کیا ہے۔

کشور اپنے اظہار کے سامنے کسی بھی مصلحت یا رکاوٹ کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتیں جن سے ان کی تخلیقات کا بے ساختہ پن اپنے عروج پر پہنچا نظر آتا ہے اور اظہار کی یہی جرات مندی انہیں بڑے فنکاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کشور ناہید، ''بُری عورت کی کتھا''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۰۔
۲۔ ایضاً ص ۹، ۱۷۔
۳۔ ایضاً ص ۱۳۰۔
۴۔ ایضاً ص ۸۱۔
۵۔ جاوید شاہین، ''میرے ماہ و سال (یوسف کی خریدار)''، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۰۔
۶۔ ڈاکٹر مبارک علی، ''تاریخ اور عورت''، فکشن ہاؤس، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۴ء، ص ۸۔
۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ''ادب کلچر اور مسائل''، پاکستان نیشنل اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷۳۔
۸۔ انتظار حسین، ''نئے زمانے کی برہن''، کتاب نما، دلی، شمارہ اپریل ۱۹۸۸ء۔
۹۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''یافت و دریافت''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۔
۱۰۔ ایضاً ص ۱۰۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۴)

ادب اور معروضی حقیقت

ایم۔خالد فیاض

پیامِ مشرق از فیض احمد فیض

دانتے نے کہا تھا کہ

''وہ چیز جس میں موسیقانہ ہم آہنگی ہوتی ہے، ایک زبان سے دوسری زبان میں، بغیر اس کی شیرینی اور موسیقی کو مجروح کیے، منتقل نہیں ہوسکتی۔''

میں بڑی حد تک اس بات سے متفق ہوں مگر ''پیامِ مشرق'' کا اردو ترجمہ جو فیض نے کیا ہے، پڑھتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا اور ترجمہ بھی اُسی موسیقیت اور شیرینی کا حامل ہو سکتا ہے جیسا کہ اصل شاہکار۔

دراصل دانتے نے شاعر اور غیر شاعر کے ترجموں میں تمیز نہیں کی۔ ایک شاعر کا ترجمہ، ایک غیر شاعر کے ترجمے سے نسبتاً زیادہ موسیقیت اور شیرینی کا حامل ہوگا۔

اس کے علاوہ تخلیق کار اور ترجمہ نگار کے آپس کی ذہنی، روحانی، فنی اور تعلیمی مماثلت بھی اِس میں معاون ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال اور فیض میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ دونوں کا شہر ایک ہے بلکہ تعلیم و تربیت میں بھی کافی یکسانیت موجود ہے۔ دونوں اُردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کے ادب سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان زبانوں پر عبور بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ فیض نے فارسی کو اظہار کی زبان نہیں بنایا مگر وہ فارسی کے رُموز و اسرار سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اس کے علاوہ فیض کا ڈکشن اقبال کے ڈکشن سے کافی حد تک مماثل ہے۔ فیض کی تراکیب کا نظام کلاسیکی روایت سے ہی جڑا ہوا ہے۔ جس طرح اقبال نے تراکیب سے معانی کی تفہیم کا کام لیا اُسی طرح فیض نے بھی اپنی شاعری میں تراکیب سے معانی کے نئے جہاں آباد کیے ہیں۔

دنیائے ادب میں فٹز جیرالڈ کا عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے اور اُس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فٹز جیرالڈ نے نہ صرف عمر خیام کے فکر و فلسفے کو ترجمہ کیا ہے بلکہ عمر خیام کی رباعیات کی فضا اور لب و لہجہ بھی دوسری زبان میں منتقل کر دیا ہے۔

''پیامِ مشرق'' کا ترجمہ پڑھتے وقت بھی اسی چیز کا احساس ہوتا ہے کہ فیض نے اقبال کے فکر و فلسفہ کے ساتھ اقبال کے لہجے کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے اور اسی فضا کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جو ہمیں ''پیامِ مشرق'' کے فارسی کلام میں نظر آتی ہے۔

مثال کے طور پر ان اشعار کے ترجمے پر غور کیجیے:

دلا نارائی پروانہ تا کے	دلا محرومیٔ پروانہ کب تک
نگیری شیوۂ مردانہ تا کے	یونہی بے شیوۂ مردانہ کب تک
یکے خود را بسوزِ خویشتن سوز	اب اپنی آگ میں بھی جل کے دیکھو
طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے	طوافِ آتشِ بیگانہ کب تک

بپائے خود مَزَن زنجیرِ تقدیر	تقدیر کو ہرگز نہ بنا پاؤں کی زنجیر
تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست	یہ گنبدِ گرداں کوئی زنداں تو نہیں ہے
اگر باور نداری ، خیز و دریاب	باور نہیں گر تجھ کو تو اُٹھ پاؤں ذرا کھول
کہ چُوں پاوا کُنی جَولاں کہے ہست	چلنے کے لیے تیرے فقط راہ یہیں ہے

اب ایک نظم ''نوائے وقت'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

تقدیرِ فسونِ من ، تدبیر فسُونِ تُو	تقدیرِ فسونِ میرا ، تدبیر فسُونِ تیرا
تُو عاشقِ لیلائے من دشتِ جُنُونِ تُو	تُو عاشقِ لیلیٰ ہے، میں دشتِ جنوں تیرا
چُوں روحِ رواں پاکم ، از چند و چگُونِ تُو	میرے لیے لاحاصل، یہ چند و چگوں تیرا
تو رازِ دروں مَن ، مَن رازِ درونِ تُو	تو رازِ دروں میرا میں رازِ دروں تیرا
از جانِ تُو پَیدا یَم ، در جانِ تُو پنہایَم	پیدا ہوں تری جاں سے، جاں میں تری پنہاں ہوں

لیکن فٹز جیرالڈ کو بہر حال فیض پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ فٹز جیرالڈ نے فارسی زبان کا ترجمہ، انگریزی میں کیا ہے جبکہ فیض نے اُردو زبان میں ہم جانتے ہیں کہ اُس وقت ترجمہ کرنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جب زبانوں میں دُوری زیادہ ہو اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انگریزی زبان کا اُردو کی نسبت فارسی زبان سے بُعد کہیں زیادہ ہے لہٰذا فٹز جیرالڈ کو زیادہ فنی مہارت سے کام لینا پڑا، اس لیے فٹز جیرالڈ کی فیض پر فوقیت مسلم ہے۔

فیض نے اِس ترجمہ میں اُن تمام شعری سہولتوں سے فائدہ اٹھایا ہے جو فارسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت میسر ہوتی ہیں مگر فارسی سے انگریزی میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کرتے وقت یہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں اور شاید یہ فائدہ حد سے کچھ زیادہ ہی اٹھایا ہے۔ اس کی شہادت کے لیے یوں تو پوری کتاب پیش کی جاسکتی ہے مگر ایک غزل کے تین اشعار بطورِ خاص پیش کیے دیتا ہوں، جن میں فیض نے فارسی تراکیب کو جوں کا توں یا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اُردو مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ پہلے اقبال کا فارسی متن دیکھیے:

هوسِ منزل لیلیٰ نہ تُو داری ونہ مَن
جگرِ گرمیِ صحرا نہ تُو داری و نہ مَن

خزفے بُود کہ از ساحلِ دریا چیدیم
دانۂ گوہرِ یکتا نہ تُو داری و نہ مَن
دِگر اَز یُوسَفِ گُم گُشتہ سُخن نَتواں گُفت
تپشِ خونِ زلیخا نہ تُو داری و نہ من

اوراب دیکھئے اُردو ترجمہ:

ہوسِ منزل لیلیٰ نہ تجھے ہے نہ مجھے
تابِ سرگرمیِ صحرا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میں بھی ساحل سے خذف چنتا رہا ہوں، تو بھی
حال ایک گوہر یکتا نہ تجھے ہے نہ مجھے
چھوڑیے یوسفِ گم گشتہ کی کیا بات کریں
خلشِ خونِ زلیخا ہ نہ تجھے ہے نہ مجھے!

یہاں ہمیں ایک بات یہ بھی مدِ نظر رکھنا ہوگی کہ فیضؔ نے جس فارسی شعری تصنیف کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا ہے، اس کا شاعر یعنی اقبال اردو زبان کا بھی شاعر ہے اور اُس کی ساڑھے تین مستند شعری تصانیف اُردو میں بھی ہیں۔ کیا ایسے شاعر کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان نہیں ہو جاتا جس کی اپنی زبان وہی ہو جس میں اُس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جا رہا ہے؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فیضؔ کے لیے حافظؔ، عمر خیامؔ یا سعدیؔ کی نسبت اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ کرنا کسی قدر آسان نہیں ہوگا؟ کیونکہ حافظ، خیامؔ یا سعدی اصل میں فارسی زبان کے ہی شعراء ہیں جبکہ اقبال بنیادی طور پر اُردو کے شاعر ہیں، باوجود اس کے کہ انہوں نے فارسی میں بھی شاعری کی۔ اگرچہ اس سوال کے جواب کے لیے مترجمین اور ماہرِ لسانیات سے رجوع کرتا ہوں مگر میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اقبال کی فارسی تصانیف کا اُردو میں ترجمہ کرنا، دوسرے فارسی شعراء کی نسبت قدرے آسان ہے کیونکہ اقبال کی فارسی زبان برصغیر کی آب و ہوا میں رچی بسی ہوئی ہے اور کافی حد تک فارسی کے شعراء سے مختلف ہے بلکہ ان کے فارسی محاورے اور اسلوب پر بعض فارسی ناقدین نے اعتراضات بھی کیے ہیں۔

اس ترجمے کی ایک خوبی، جس نے بڑی حد تک متاثر کیا، یہ بھی ہے کہ فیضؔ نے اقبال کے افکار کو اپنی ذات میں ضم کرنے کے بعد تخلیقی سطح پر ''پیامِ مشرق'' کا ترجمہ کیا ہے اور اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ فیضؔ نے ترجمے میں اقبال کی آواز اور لب ولہجہ کو تو قائم رکھا ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی آواز اور لہجہ کو بھی اجاگر کیا ہے لیکن اس طرح کہ اقبال کا لہجہ مجروح نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر نظم ''جہانِ عمل'' کے یہ اشعار دیکھئے:

یہ خرابات ہے اس بزم میں ہے دعوتِ عام

مے پلاتے ہیں یہاں سب کو باندازۂ جام
حرف اُس راز کا جو صَوت سے بیگانہ ہے
جام سے ٹپکا تو یہاں آ کے بنا حرفِ کلام
دل میں وہ ذوقِ طلب لے کے چلے ہیں ہم لوگ
علم کو جانِ عمل دے کے چلے ہیں ہم لوگ

اوراب غزلیات کے چنداشعار:

اس طرح قصہ مرا ہر خار پروا کر دیا
بھیج کر دشتِ جنوں میں مجھ کو رسوا کر دیا
سو جہاں میرے خیالوں نے کھلائے مثلِ گل
تو نے اک تخلیق سے خون تمنا کر دیا
مجھ کو جدت کی لگن ہے ڈال طرح نو کوئی
کیوں مجھے سرگشتۂ اِمروز و فردا کر دیا

آرزو ہے کہ نظر آئے مرا ماہِ تمام
ہاتھ سینے پہ ہے اور آنکھ لگی ہے لبِ بام
میں نہ اِمروز نہ دِیروز نہ فردا میں اسیر
سنگِ رہ ہے مرے رستے میں، نہ منزل نہ مقام

ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ترجمے میں کہیں الجھاؤ یا ابہام پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ بڑی حد تک سیدھا سادا، رواں اور سلیس ترجمہ ہے۔ مگر اپنی پوری اثر آفرینی اور اپنے پورے معنوی اور شعری اسلوب کے ساتھ اور سب سے اہم بات کہ فن پارے کی ادبیت پوری طرح قائم رہی ہے۔

کولرج نے کہا تھا کہ نظر کا ترجمہ چاہے نظر میں ہو یا نہ ہو لیکن شاعری کا ترجمہ شاعری میں ضرور ہونا چاہیے۔ فیضؔ نے اقبال کی نہ صرف شعریت کو شاعری میں ڈھالا ہے بلکہ نظم کو بھی نظم میں پرویا ہے۔ فیضؔ نے ہمارے شعری مزاج کے مطابق جو کلاسیکی انداز کا ہے، ترجمے میں اوزان وقوافی کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور نظم کی پابند ہیئت کو اپنایا ہے۔

فارسی زبان میں شاعری کرنے کی وجہ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں یوں بیان کی کہ اگرچہ اردو زبان کی مٹھاس میں کوئی شبہ نہیں، مگر فارسی میں جو رسیلا پن ہے، اردو اس سے محروم ہے۔ جب اقبال کی کتابیں پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ شائع ہوئیں تو پروفیسر حمید احمد خاں نے اقبال سے کہا کہ آپ نے اردو میں لکھنا بالکل ترک کر دیا ہے تو اقبال نے انگریزی میں جواب دیا کہ

"It comes to me in Persian" یعنی ''شعر مجھ پر وارد ہی فارسی میں ہوتا ہے۔'' یعنی اقبال نے اسی زبان شیرینی کو اپنے اظہار کے لیے زیادہ موزوں اور ہم آہنگ پایا۔

فارسی چونکہ ایک عرصے تک مسلمانوں کی برصغیر میں سرکاری، ثقافتی اور ادبی زبان رہی اور اس کے علاوہ اردو کی نسبت فارسی زیادہ بااعتبار اور وسیع تاریخی و ادبی پس منظر کی وجہ سے احساسِ برتری کی غماز بھی تھی۔ اقبال اگر فارسی میں اظہار کرنے پر اپنی طبیعت کو مائل پاتے ہیں تو اس کے مندرجہ بالا نفسیاتی اور ثقافتی اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر بقول اقبال، فارسی میں اظہار کی سب سے بڑی وجہ فارسی زبان میں وسیع شعری امکانات کا موجود ہونا ہے۔

فیضؔ کا ''پیامِ مشرق'' کا اردو ترجمہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے اس تاثیر کو بھی کسی حد تک رد کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اس کاوش سے اردو شاعری میں اظہار کے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جس وقت فیضؔ ''پیامِ مشرق'' کا ترجمہ کر رہے تھے یعنی 1977ء کے لگ بھگ تو اردو شاعری، معریٰ نظم اور آزاد نظم سے ہوتی ہوئی نثری نظم تک پہنچ چکی تھی۔ فیضؔ ''پیامِ مشرق'' کے ترجمہ کے لیے نثری یا آزاد اسلوب اپنا سکتے تھے۔ جبکہ دنیائے ادب میں شاعری کے ترجمے کے لیے یہی اسلوب زیادہ رائج اور قابلِ اعتبار بھی ہے اور فیضؔ کے سامنے ضرور یہ نمونے موجود بھی ہوں گے، مگر انہوں نے باقاعدہ منظوم ترجمہ کرنے کو فوقیت دی اور باقاعدہ بحور، اوزان اور قوافی کا اہتمام کیا ہے۔ جس سے اشارہ ملتا ہے کہ فیضؔ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس فکر و فلسفے کی شاعری، اردو زبان میں بھی بار پا سکتی ہے۔ فیضؔ ''پیامِ مشرق'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ

> ''اُردو اور فارسی میں قربت کے باوجود اظہار و آہنگ کے پیرائے کافی مختلف ہیں۔ فارسی زبان کو تراکیب اور مشتقات کی وجہ سے اجمال و اختصار کی جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اردو میں موجود نہیں اس لیے اگر ترجمہ میں مفہوم اور معانی کے علاوہ اوزان و قوافی اور اصوات و آہنگ میں بھی اصل سے تطابق کی سعی کی جائے تو کافی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس لیے میں نے انتخاب میں انہیں منظومات پر اکتفا کیا ہے جن میں یہ التزام کسی حد تک ممکن تھا بلکہ ان میں بھی جو اشعار میری گرفت میں نہیں آ سکے میں نے حذف کر دیے ہیں۔''

اِس سے ظاہر ہے کہ فیضؔ نے جان بوجھ کر ترجمہ میں اوزان و قوافی اور اصوات و آہنگ کا التزام کیا ہے اور جہاں ایسا نہیں کر سکے وہ حصے انہوں نے حذف کر دیے۔ فارسی میں اجمال و اختصار کی جن سہولتوں کی طرف فیضؔ نے اشارہ کیا ہے، فارسی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت ان کی کمی کا احساس ضرور ہو سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس خیال یا فکر کا اظہار فارسی میں ہو سکتا ہے، اردو میں بالکل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اگر فیضؔ آدھی یا ایک تہائی ''پیامِ مشرق'' کو اردو میں ڈھال سکتے ہیں تو کیا اقبال

پوری ''پیامِ مشرق'' کو اردو میں نہیں لکھ سکتے تھے؟ اور یوں بھی موضوعات کے حوالے سے اگر ''پیامِ مشرق'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کے موضوعات اقبال کی اردو شاعری کے موضوعات سے کوئی بہت زیادہ مختلف بھی نہیں کہ جن کو بیان کرنے کے لیے فارسی زبان انتہائی ضروری ہو۔

مگر اِس سب کے باوجود ہم کسی شاعر یا تخلیق کار پر یہ پابندی عائد نہیں کر سکتے کہ وہ اظہار کے لیے کون سی زبان اختیار کرے اور فیضؔ نے بھی کہیں اقبال پر اس حوالے سے تنقید نہیں کی اور شاید کسی بھی حوالے سے کبھی فیضؔ نے اقبال پر تنقید نہیں کی، ہاں ''پیامِ مشرق'' کے ترجمہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کی ہے کہ ''پیامِ مشرق'' کے افکار و نظریات کو اردو شاعری میں بھی اتنی ہی خوبصورتی سے بیان کیا جا سکتا ہے جتنا کہ فارسی شاعری میں۔

اصل ''پیامِ مشرق'' چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ''لالۂ طُور'' کے نام سے رباعیات ہیں۔ دوسرا ''افکار'' کے تحت نظموں پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ ''مے باقی'' کے عنوان سے غزلیات سے عبارت ہے اور چوتھے میں ''نقشِ فرنگ'' کے عنوان سے جو نظمیں شامل ہیں ان کا موضوع مغربی افکار و سیاست ہے۔ فیضؔ نے ''پیامِ مشرق'' کے ان چار حصوں کا تقریباً ایک تہائی حصہ ترجمہ کیا ہے، جسے انتہائی مختصر انتخاب کہا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے کتاب پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ خاص طور پر چوتھا حصہ ''نقشِ فرنگ'' کی انتہائی کم نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر اس کے مختصر انتخاب ہونے کی وجہ فیضؔ نے پیش لفظ میں بیان کر دی ہے۔

بہر حال اس کے باوجود، فیضؔ نے جس قدر بھی ترجمہ کیا ہے، اردو ترجمہ کی شعری روایت میں اس کا مقام بلند تر ہے۔ اس لیے ''انتخاب پیامِ مشرق'' فیضؔ کی کاوش ہے اور اس کی ہی تخلیق ہے اور اسے فیضؔ کی شعری تخلیقات کے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔

فیضؔ کا یہ ترجمہ اُن کی ہمعصر نسل کے لیے تو زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ کیونکہ ان کے عہد میں لوگ فارسی سے بڑی حد تک آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ اس وقت کی بہت بڑی ضرورت نہیں تھا اور شاید اسی لیے ہمارے بہت سے ادبی بزرگ اس بات سے لاعلم ہیں کہ فیضؔ نے اقبال کی ''پیامِ مشرق'' کا اردو ترجمہ بھی کیا ہوا ہے کیونکہ انہیں اس ترجمہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن انگریزی کا اثر و رسوخ بڑھ جانے کی وجہ سے بعد میں آنے والی نسل جو فارسی سے آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی جا رہی ہے، اس ترجمے کے لیے فیضؔ کی احسان مند ہے۔ لہٰذا فیض کا یہ ترجمہ اس عہد کی ضرورت ہے اور شاید یہ بات ترجمہ کرتے وقت فیض کے بھی پیش نظر رہی ہوگی۔ اس لیے ہماری نسل کے لیے اس ترجمہ کی اہمیت مسلم ہے۔

☆☆☆

جوزف کانریڈ/ڈاکٹر فاروق عثمان

آؤٹ پوسٹ آف پروگرس ☆

اِس تجارتی مرکز کے انچارج دو سفید فام تھے۔ کے اِرٹس جو چیف تھا، یہ ذرا چھوٹے قد کا مائل بہ فربہی شخص تھا۔ اور کارلیٹر جو کہ نائب تھا لمبا، سر بڑا سا، کمر چوڑی اور دو پتلی لمبی ٹانگوں والا تھا۔ سٹاف کا تیسرا شخص سیرالیون کا ایک حبشی تھا۔ جو کہتا تو یہی تھا کہ اُس کا نام ہنری پرائس ہے۔ لیکن دریا کے نچلی طرف کے مقامی لوگ اُسے ماکولا کے نام سے بلاتے تھے اور یہی نام سارے علاقے میں مشہور بھی ہو گیا تھا۔ اِس کی کیا وجہ تھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں صحیح لب ولہجہ میں بول سکتا تھا۔ اُس کا خط خوبصورت اور وہ حساب کتاب رکھنے کا ماہر تھا۔ اور دل کی گہرائیوں سے سحر جادوٹونے پر اعتقاد بھی رکھتا تھا۔ اُس کی بیوی لونڈا کی حبشن تھی، گرانڈیل اور پرخروش اِن کے تین بچے تھے جو اُن کی شیڈ کی طرح کی نیچی چھت والی رہائش گاہ کے دروازے کے سامنے دِن بھر لڑھکتے پھرتے رہتے۔ ماکولا طبعاً چپ چاپ اور گھنّا سا آدمی تھا۔ وہ دونوں سفید فاموں کو بھی اکثر اوقات نظر انداز کر جاتا۔ وہ اِس چوکی پر گارے سے لپے پتے اور گھاس پھونس سے بنی چھت والے سٹور کا نگران تھا، اور اسے یہ زعم تھا کہ وہ سٹور میں رکھی جانے والی اشیاء کپاس، کپڑے منکے مہرے وغیرہ کا ٹھک ٹھیک حساب رکھتا ہے۔ اِس سٹور ہاؤس سے ذرا ہٹ کر اس تجارتی چوکی کی بڑی عمارت تھی اِس کے تین کمرے ایک قطار میں تھے اِن کے چاروں طرف ایک برآمدہ تھا۔ یہ بلڈنگ صفائی ستھرائی کے ساتھ سرکنڈوں اور نرسل سے بنائی گئی تھی۔ درمیان والا کمرہ نشت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا دو اَن گھڑی سی میزیں اور کچھ سٹولز اِس کی کل کائنات تھے دوسرے دو کمرے بیڈ رومز کے طور پر استعمال ہوتے تھے ہر کمرے میں ایک طرف مچھر دانی لگا لکڑی کا

☆ یہ جوزف کانریڈ کی ایک طویل مختصر کہانی ہے۔ یہ کہانی ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی۔ اس کا لوکیل وسطی افریقہ ہے۔ ہارٹ آف ڈارک نیس جو کانریڈ کا ایک شاہکار ناول ہے۔ اس کے دو سال بعد لکھا گیا۔ اس کے جراثیم ہمیں اس کہانی میں ملتے ہیں۔ اس کہانی میں کرداروں کی اندرونی کیفیتوں کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے اُن میں ایک اِکراہ بھی پیدا ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ ایک ہمدردی بھی جاگتی ہے۔ اس کہانی کے اندر جو ایک انسانی تہذیب اور ترقی کے حوالوں پر جو تیز اور ٹیلی طنز موجود ہے وہ اسے آج کے سوالات کے ساتھ جوڑتی ہے ورجینا وولف نے کہا تھا ''ادیب ہمارا معاصر ہوتا ہے'' کانریڈ کی کہانیاں کالونیلزم کے اس عہد سے تعلق ضرور رکھتی ہیں جب افریقی اور ایشائی وسائل کو بے دردی سے لوٹا جا رہا تھا اور انسان کی تذلیل کی جا رہی تھی کیا یہ سب کچھ افریقی اور ایشیائی قوموں کی نام نہاد آزادی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کانریڈ کی کہانیاں آج بھی ہمیں سچا اور کھرا جواب مہیا کرتی ہیں۔ کانریڈ والدین کی طرف سے پولینڈ کا باشندہ تھا۔ پیدائش اس کی یوکرائن میں ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں برطانیہ کی مرچنٹ نیوی میں ملازم ہوا۔ غالباً پہلا غیر انگریز ہے جسے انگریزی ادب کی تاریخ میں ایک محترم مقام حاصل ہوا ہے اور کلاسیک میں شمار کیا جاتا ہے۔

چبوترہ نما بیڈ بنا ہوا تھا۔ باقی سارے میں تختوں سے بنے فرش پر اِن سفید فاموں کی ذاتی استعمال کی اشیاء بکھری پڑی رہتی تھیں۔ اَدھ کھلے منہ والے صندوق پرانے میلے کچیلے کپڑے پھٹے پرانے جوتے اور ہر قسم کی الا بلا اور اُن کے درمیان یہ بے سلیقہ اور پھوہڑ بڑے عجیب معلوم ہوتے۔۔۔ اِس مین بلڈنگ کے ذرا آگے ایک طرف ہٹ کر ایک شیڈ سا بنا ہوا تھا اِس میں ایک لمبی سیدھی کھڑی صلیب کے نیچے ایک قبر کے اندر وہ انسان سو رہا تھا جس نے تجارتی کارناموں کا یہ سارا خواب دیکھا تھا اُس نے اپنے سامنے دریا کے کنارے پر اِس تجارتی چوکی کو تعمیر کرایا۔۔۔ وہ اپنے ملک میں تو ایک ناکامیاب پینٹر تھا اور بھوکے پیٹ کے ساتھ شہرت کے تعاقب میں افریقہ کے اِن تاریک جنگلوں میں ایک تجارتی کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے آ پہنچا تھا۔ وہ اِس ترقی کی ضامن چوکی کا پہلا چیف تھا۔ ماکولا نے اِس آرٹسٹ کو بخار میں مبتلا مرتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ یہ بات بڑی لاتعلقی سے یہ کہہ کر کہ ''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا''، سنایا کرتا تھا۔ پھر وہ (ماکولا) تنہا کچھ عرصہ تک اِس چوکی کے کام کاج اور دوسرے کارکنوں کا اکیلا انچارج بھی رہا۔ گویا وہ اپنے بیوی بچوں، رجسٹروں کتابوں اور اُن ساری بدروحوں سمیت اِس چوکی پر اکیلا حکمرانی کرتا رہا۔ غالباً کمپنی والوں نے بعد میں اُسے اِس بات پر راضی کر لیا تھا کہ کبھی کبھار سفید فام بھی اُس کے ساتھ اِس سارے کھیل میں شریک ہو جایا کریں گے۔

بہرحال گریٹ ٹریڈنگ کمپنی کے ڈائریکٹر ایک بڑے صندوق نما سٹیمر میں جس پر ایک چھت نما شیڈ بھی بنا ہوا تھا آئے انہوں نے تجارتی سٹیشن کو بہتر حالت میں پایا ماکولا حسبِ معمول ایک بہترین خاموش کارکن کی حیثیت سے موجود تھا۔ انہوں نے کے اِرٹس کا خالی جگہ پر چیف کے طور پر تقرر کیا اور کو اُس کا نائب بنایا۔ خود ڈائریکٹر جو ایک زشت خو جابر مگر چست اور کارگزار آدمی تھا اور جو کبھی کبھار بڑے ہلکے انداز میں سنجیدگی کے ساتھ تھوڑا بہت مزاح بھی کر لیتا تھا اُس نے اِن دونوں کے سامنے ایک تقریر بھی کی۔ اِس تجارتی چوکی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ اِس چوکی سے قریب ترین دوسری چوکی کوئی ۳۰۰ میل کے فاصلے پر تھی اور یہ چیز قدرے زیادہ کمیشن کا حصول کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ اِس مقام پر اِن مبتدی کارکنوں کی تقرری گویا ڈائریکٹر کی مہربانی تھی۔ اِس بات نے خاص طور پر کے اِرٹس کے دِل میں ڈائریکٹر کے لیے شکر گزاری کے گہرے جذبات پیدا کر دیئے۔ اُس نے بڑے خوشدمدانہ لہجے میں اُس سے کہا وہ اپنے آپ کو پوری طرح اِس بات کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ کے اِرٹس ٹیلی گراف کے شعبے میں خدمات سرانجام دیتا رہا تھا اس لیے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا گُر جانتا تھا۔ کارلیز فوج میں کیولری کا سابق نان کمشنڈ آفیسر تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹر نے تیزی سے اردگرد کے پھیلے ہوئے جنگل اور بلند و بالا اُگی ہوئی گھاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سختی سے بھنچے ہوئے جبڑے کے ساتھ بُڑبُڑایا ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ پھر ملیں گے'' یہ کہہ وہ صندوق نما سٹیمر پر سوار ہو کر اگلے چھ ماہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ سٹیمر کے ڈیک پر کھڑے ہوئے جب ڈائریکٹر نے رخصتی انداز میں اپنے ہیٹ کو چھوا اِن دونوں

نے تیزی سے ہیٹ ہلا کر اُسے رخصت کیا۔ جب یہ ہیٹ ہلا ہلا کر اُچھل رہے تھے تو ڈائریکٹر نے اپنے قریب کھڑے ہوئے یک پرانے ملازم سے کہا تھا ذرا اِن بے وقوفوں کو دیکھو یہ مجھے بعض اشیاء کے نمونے بھیجنے کے لیے بے تاب ہوں کے میں نے سارے کارکنوں سے کہا ہے کہ یہاں سبزئیوں کا کھیت تیار کرو نیا سٹور ہاؤس بھی بنایا جائے اور ایک گودی بھی تیار کرواور میں شرط لگاتا ہوں کہ اِن میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ہمیشہ دریا کے اِس کنارے پر اِس جگہ تجارتی چوکی کو غیر منافع بخش سمجھا ہے ___ افسران سے میرا یہی اختلاف رہا ہے ___ میں اِن دونوں کو اِن کی افتادِ طبع کے باعث اِسی جگہ کے قابل سمجھتا تھا اِس لیے انہیں یہیں اُتار دیا چلو کم از کم اگلے چھ ماہ تک تو اِن سے نجات ملی۔

وہ دونوں کنارے پر کھڑے اگلے موڑ تک سٹیمر کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کنارے سے چوکی کی عمارت کی طرف اُترنے لگے ___ وہ دونوں اِس وسیع وعریض تاریک بر اعظم میں بہت کم وقت کے لیے رہے تھے اور یہ وقت بھی انہوں نے اپنے جیسے بہت سے سفید فام لوگوں اور افسروں کے درمیان اُن کی رہنمائی میں گذارا تھا، لیکن اب ایک نئے اور ویران سے پُر اسرار منظر کے بیچوں بیچ انہوں نے اپنے آپ کو بڑا اکیلا محسوس کیا۔ یہ ویرانہ انہیں اجنبیت سے معمور اور اپنی ساری سرسبزی شادابی اور قوتِ نمو کے باوجود کچھ ڈرا رہا تھا۔ وہ دونوں بڑی معمولی شخصیت اور نااہل طبیعت کے انسان تھے۔ یہ ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی موجودگی صرف ایک کارگزار شعبہ کے انسانوں کے درمیاں ہی اظہار پا سکتی ہے۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ان کی زندگی اُن کے کردار کا جوہر اُن کی صلاحیتیں ان کی دلیری جرأت مندی اس اعتماد کے ساتھ ہی اظہار پا سکتی ہے کہ وہ اِردگرد کے ماحول میں پوری طرح محفوظ ہیں ان کی جرأت خاطر جمعی یقین جذبات اُصولیات سب کا رشتہ زیادہ سے زیادہ اجتماع کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اجتماع جو اپنے اداروں کی قوت اور اخلاقیات کے ضابطوں پر اندھا یقین رکھتا ہے، لیکن اِس صورتِ حال سے دوری نہیں مطلق وحشت اور انسان کی قدیمی جبلتیں اچانک ایک بلا بن کر نازل ہوتی ہیں۔ تنہائی کا احساس محسوسات میں شراکت سے محرومی معمولات کی نفی غیر معمولی کی زیادتی یا پھر وقوعات کا جہنم سے بالاتر ہونا اُن ساری جنگلی جبلتوں کو مہمیز کرتا ہے اور مہذب اور غیر مہذب دونوں کے اعصاب یکساں طور پر تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

کے اِرٹس اور کارلیز دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بچوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے، اندر سے قدرے سہمے سہمے لیکن اوپر سے چہکتے اُچھلتے کودتے ۔۔۔۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا ہمارا اسٹیشن نہایت خوبصورت جگہ پر واقع ہے دوسرے نے اثبات میں سر ہلا کر اِس کی خوبصورتیاں گنوانی شروع کر دیں۔ کارلیز کہنے لگا: ''مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں کی آب وہوا اتنی مختلف نہیں بس ذرا دھوپ میں چلنے پھرنے سے احتیاط کرنی ہوگی۔''

اِسی لمحے وہ قبر کے قریب سے گزرے کے اِرٹس نے افسوس کرتے ہوئے کہا: ''غریب

بے چارہ۔۔۔'' کارلیز نے بات کاٹ کر کہا ''بخار سے فوت ہوا تھا مجھے بتایا گیا ہے'' کے اِرٹس نے کہا ''آخر کیوں'' ''بس دھوپ کے معاملے میں بے احتیاطی کی'' کارلیز نے جواب دیا۔

اچھا تو پھر کارلیز سنو میں یہاں کا چیف ہوں اور تجھے حکم دیتا ہوں کہ دھوپ میں بالکل نہ پھرنا ___ سُن رہے ہونا ___'' کے اِرٹس نے اپنی اہمیت اور منصب کو ذرا مزاحیہ انداز میں جتاتے ہوئے کہا لیکن اُس کی نصیحت میں ایک سنجیدگی بھی تھی۔ یہ خیال کہ اُسے کارلیز کو اکیلے ہی نہ دفن کرنا پڑے یا پھر اُسے یہاں اکیلا ہی نہ رہنا پڑ جائے بذات خود لرزا دینے والا تھا۔ اُسے اچانک محسوس ہونے لگا کہ کارلیز اِس تاریک براعظم کے درمیان اُس کے لئے اُس سے زیادہ اہم ہو گیا ہے جتنا کسی اور جگہ سگا بھائی ہو سکتا ہے۔ کارنیئر نے بھی بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے سلیوٹ کیا اور کہا۔۔۔ ''جنابِ والا آپ کے احکام کی تعمیل ہو گی'' پھر اُس نے قہقہہ لگایا اور کے اِرٹس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ''دوست ہم یہاں زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کریں گے''۔۔۔ بس چپ چاپ بیٹھے رہیں گے اور یہ جنگلی جو ہاتھی دانت لائیں گے اُسے اکٹھا کریں گے۔ بہر کیف اِس علاقے کے خوش کن مناظر تو ہیں ہی'' وہ دونوں اونچا اونچا ہنسنے اور ہاتھ پر ہاتھ مارنے لگے۔ اِسی دوران کارلیز کو یہ بد بخت خیال بھی آیا کہ کے اِرٹس کتنا موٹا ہے اور کچھ صحت بھی ٹھیک نہیں اگر مجھے اسے دفن کرنا پڑا تو کتنا خوفناک ہوگا پھر اُس نے اپنے سر کو جھٹکا اور اِس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر بھی اپنی رہائش گاہ کے ورانڈے تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک دوسرے کو یار جانی کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔

تجارتی مرکز پر یہ اُن کا پہلا دن تھا وہ بڑے چست وچالاک نظر آئے۔ ہتھوڑا اور کیل لے کر نقشیں کپڑے کی تہوں کو سلجھانے اور پردے لٹکانے اور گھر کو رہنے کے قابل بنانے میں خوب خوش دلی سے مصروف رہے وہ نئی جگہ پر ٹھیک ٹھاک طور پر آغاز کرنا چاہتے تھے۔

زندگی کے معمولی معمولی معاملات کو نپٹانے کے لئے بھی ایک دماغی یکسوئی اور تھوڑی بہت جرأت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ دونوں اِس معاملے میں بھی اوسط درجے سے بھی کم تر تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا نے اُنہیں اپنی کسی خاص ضرورت کے تحت اِس طرح تیار کیا ہے کہ یہ نہ کوئی انفرادی سوچ رکھتے تھے نہ آگے بڑھنے کی کوئی امنگ تھی اور نہ ہی ایک روٹین سے نکلنے کی خواہش۔ بس ایک مشین کے سے انداز میں زندہ تھے۔ اب جبکہ وہ کان کے پیچھے قلم رکھنے والے ہر معاملات اور مسائل پر مشورہ دینے والے یا پھر آستین کے کف پر سنہری ڈوری ٹکے کسی بندے کی ماتحتی سے آزاد ہو چکے تھے تو اِن کی حالت بعد مدت کے ایسے رہائی پانے والے کی تھی کہ جسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ اپنی آزادی کے دن کا آغاز کیسے کرے۔

در ماہ گزر گئے ۔۔۔۔ کے اِرٹس اکثر کہتا اگر میری میلی کا معاملہ نہ ہوتا تو تم مجھے یہاں نہ پاتے۔ میلی اِس کی بیٹی تھی اُس نے ٹیلی گراف کی ۱۷ سالہ سروس کو اپنی بیٹی کی شادی کے لئے کچھ رقم جمع کرنے کی خاطر چھوڑا تھا۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی اور بچے اپنی پھوپھی کے پاس رہتے تھے۔ وہ اپنے شہر کی

گلیوں فٹ پاتھوں اور اُن کیفوں کو یاد کرتا جہاں سال ہا سال اُس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور گپ لگائی تھی وہ اُن خیالات کو اپنے ذہن میں دہراتا جو نوکری کے دنوں میں اُس کے ذہن آتے تھے اور جو صرف ایک حکومتی کلرک کو ہی تسکین دے سکتے تھے۔ دفتر کی چھوٹی چھوٹی دشمنیاں چھوٹی چھوٹی خباثتیں سب یاد آتیں۔۔۔ ''اگر میرا سالا ذرا بھی دل والا ہوتا تو میں بھی یہاں نہ ہوتا۔'' کارلیز کے خیالات بھی کچھ اِسی طرح کے تھے۔ اُس نے آرمی چھوڑ دی یا اپنی کاہلی اور ڈھیٹ پن کی وجہ سے اپنے آپ کو ساری فیملی کا ناپسندیدہ بنا لیا۔ اِس پر مشتعل ہو کر اُس کے سالے نے اُسے اِس کمپنی میں زبردستی سیکنڈ کلاس ایجنٹ کے طور پر بھرتی کرا دیا۔ اپنی مفلسی کو دیکھتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ اب اِن رشتہ داروں کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہیں نکلوائی جا سکتی اُس نے اِس اسامی کو قبول کر لیا کسی نہ کسی طرح زندہ تو رہنا تھا۔ وہ بھی کے اِرٹس کی طرح گذشتہ زندگی کو یاد کر کے روتا تھا۔۔۔ اُسے اپنے چمکتے ہوئے اسلحے کی یاد آتی بیرکوں کے مزاح اور قہقہے اکثر کانوں میں گونجتے گیریژن ٹاؤن کی لڑکیاں بھی بہت یاد آتیں۔ کارنیئر کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ بات کو دل میں رکھتا تھا، چونکہ دنیا نے اُس سے مسلسل غلط برتاؤ کیا تھا (کم از کم اُس کی نظر میں) اِس لئے وہ کچھ موڈی سا ہو گیا تھا۔ البتہ اِن نئے حالات میں یہ دونوں کاہل اور کم عقل دوست ایک دوسرے کے ساتھ خوب نبھا رہے تھے۔ سارا دن دونوں نے کچھ بھی تو نہیں کرنا ہوتا تھا۔ بس بیٹھے کرسیاں توڑتے رہتے اور سمجھتے اُنہیں اِسی کی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ اِس وسیع سٹیشن پر اندھوں کی طرح رہتے تھے کہ جو بس اُسی چیز کو جانتے جو اُن کے سامنے آ جاتی اور یہ جاننا بھی کچھ ادھورا سا ہوتا وہ معاملات کے پیشگی شعور سے عاری تھے۔ دریا، جنگل عقبی گھاٹی سارا علاقہ اپنی زندگی کی ہمہ ہمی کے ساتھ اُن کے لئے تو صرف ایک خلا کی حیثیت رکھتا تھا یہاں تک کہ یہاں کی تیز روشنی دھوپ چیزوں کے اسرار کو اُن پر منکشف نہ کرتی اُن کے سامنے جو کچھ ہوتا رہتا وہ اس سے لاتعلق رہتے۔ دریا اُن کے لئے نہ کہیں سے آتا تھا اور نہ کہیں جاتا تھا بس محض بہہ رہا تھا اور اِس خالی محض سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی نوکائیں ہاتھ میں نیزے پکڑے آدمیوں سے لدی پھندی آ جاتیں۔ وہ لوگ سب سٹیشن کے صحن میں اکٹھے ہو جاتے اُن کے رنگ سیاہ چمکدار ہوتے اُن کے نیم عریاں جسم سیپوں اور منکوں سے مزین گٹھے ہوئے ہوتے، اُن کے آنے سے ایک بے قاعدہ سا شور شرابا شروع ہو جاتا۔ اُن کی چلت پھرت میں ایک حاکمانہ انداز ہوتا اور وہ اپنی سفید تیزی سے چکراتی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر کی چیزوں کو دیکھتے جاتے۔ یہ لمبی لمبی قطاروں میں صحن میں بیٹھ جاتے۔ اِس دوران اِن کے سردار ماکولا کے ساتھ سودا بازی میں جھگڑتے رہتے گھنٹوں تکرار ہوتی رہتی۔ کے اِرٹس اپنی کرسی پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہتا کبھی کبھی اِدھر اُدھر نیلی نیلی گول آنکھیں گھماتے ہوئے کارنیئر سے کہہ دیتا ''دیکھو دیکھو۔۔۔ کبھی ایسا چہرہ پہلے بھی دیکھا ہے۔۔۔ مضحک سا مگر وحشی۔۔۔'' کارنیئر ایک چھوٹے سے لکڑی کے پائپ میں مقامی تمبا کو پیتے ہوئے اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے حبشیوں پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیتا۔۔۔ ''اچھے جانور ہیں، کچھ ہڈیاں لائی

ہیں۔۔۔ ذرا اُس فلاں والے کے آگے پیچھے تو دیکھو اور وہ جو آخر سے تیسرا بیٹھا ہے، بازو تو ٹھیک ہیں لیکن ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے بہت پتلی ہیں اِن کے ساتھ تو یہ کیولری میں شامل نہیں ہو سکتا، پھر ایک مطمئن انداز میں اپنی پنڈلیوں کی طرف نظر ڈالتا اور ماکولا سے کہتا ___ تمہیں اِن سے بدبو نہیں آ رہی اِس ریوڑ کو اُس مقام مقدس پر لے جاؤ۔۔۔ (مقام مقدس کا لفظ ہر تجارتی چوکی پر سٹور ہاؤس کے لئے بطور اصطلاح بولا جاتا تھا) جو الا بلا کھانے پینے کے لئے انہیں دو کے اِرٹس بھی اِس پر صاد کرتا اور کہتا ہاں ہاں لے جاؤ اور یہ جھک جھک وہیں جا کر نپٹاؤ۔۔۔ اور خیال رکھنا۔۔۔ میں اُسی وقت آؤں گا جب تم ہاتھی دانت کا وزن کرنے لگو گے۔ ہمیں ذرا اِسی معاملے میں زیادہ محتاط رہنا چاہیے، پھر کے اِرٹس کہتا بھول گئے۔۔۔ پہلے یہ قبیلہ آیا تھا۔۔۔ دریا کے نیچے کی طرف رہتا ہے اِن کے جسم سے ایک باس سی آتی رہتی ہے۔

اِس طرح کی منافع بخش آمدن بہت کم ہی ہوتی تھی۔ تجارت اور ترقی کے یہ نمائندے آگ کی طرح برستی دھوپ میں تپتے خالی صحن کو تکتے رہتے۔ اونچے اونچے کناروں کے درمیان دریا خاموشی سے بہتا رہتا۔ دریا کے درمیان ریتلے ٹاپو پر دریائی گھوڑے اور مگرمچھ بھی کاہلی سے پاس پاس پڑے رہتے۔ تجارتی مرکز کے چاروں طرف عظیم جنگل چپ کی چادر میں لپٹا بے حس و حرکت نظر آتا۔

دونوں سفید فاموں کو اپنے پیش رَو کے کچھ بوسیدہ سے ناول اور کتابیں اِدھر اُدھر سے مل گئی تھیں اور چونکہ اِس طرح کی کوئی شے انہوں نے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ اس لیے ان کہانیوں کے پڑھنے میں بڑا لطف آنے لگا۔ لمبے دنوں کا یہ ایک اچھا مصرف تھا۔ پھر پڑھنے کے بعد اِن کے درمیان کہانی کے پلاٹ اور کرداروں کے بارے میں ایک بے وقوفانہ سی بحث چل پڑتی۔ اور یہ سارے کردار افریقہ کے اِن جنگلوں کے بیچوں بیچ اِس سنسان تجارتی مرکز پر اِس طرح بحث کا موضوع بن جاتے جیسے وہ اِن کے جیتے جاگتے دوست ہوں۔ وہ اِن کی خوبی خامیوں پر گفتگو کر کے اِن کے عمل ردِعمل پر فیصلے دیتے اِن کے جرموں پر غصے میں آ جاتے اور اِن کی زندگیوں کے دل گداز اور دردمند لمحے اِن کو ہمدردی سے بھر دیتے۔ بعض اوقات اِن کی مشکلات کی وجہ سے کارلیز کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اور وہ کہتا۔۔۔ ''بھئی یہ لاجواب کتاب ہے۔۔۔ مجھے تو خیال بھی کبھی نہیں آیا کہ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔۔۔'' اِن کو اِن کتابوں کے علاوہ بھی کچھ کاغذات ملے تھے جن میں بڑے تفاخر سے اپنی کالونیل توسعیات کے بارے میں باتیں کی گئی تھیں اِن میں تہذیب حقوق اور فرائض کے بارے میں بڑے بلند و بانگ دعوے کیے گئے تھے۔ اور تہذیب سکھانے کے عمل کو بڑی تقدیس کا درجہ دیا گیا تھا۔ اُن لوگوں کی تعریف بیان کی گئی تھی جنہوں نے سچائی اور ایمان کی روشنی کے ساتھ ساتھ تمدنی اور تہذیبی ترقی کے لیے تجارت کا شعور بیدار کرنے کے لیے ان دور دراز کی تاریک اور خطرناک جگہوں کا سفر کیا اور مصائب برداشت کیے۔ کے اِرٹس اور کارلیز اِن کو پڑھ پڑھ کر فخر اور انبساط سے بھر جاتے اور اپنے آپ کو انہیں عظیم لوگوں میں شامل

محسوس کرتے۔ایک شام کارلیز خیال میں ڈوبا کہنے لگا۔۔۔''سو سال بعد ممکن ہے یہاں ایک بڑا سارا قصبہ ہو، ایک بڑی سی گودی مال خانے ہوں۔۔۔بلیرڈ رومز ہوں۔۔۔ بیرکس ہوں ایک مکمل مہذب قصبہ میرے یار اور بچے سکول میں پڑھ رہے ہوں گے کہ کے اِرٹس اور کارلیز نامی دو سفید فام وہ پہلے مہذب انسان تھے جو اِس جنگلی علاقے میں وارد ہوئے۔کے اِرٹس سر ہلا کر تائید کرتا اور کہتا''ہاں ہاں یہ بات دل کو تو لگتی ہے'' ایسے میں وہ اپنے مرے ہوئے پیش رو کو بھول جاتے۔حالانکہ صرف ایک دِن پہلے ہی تو کارلیز نے قبر پر ٹیڑھی ہو جانے والی صلیب کو سیدھا کر کے گاڑھا تھا۔اور پھر کے اِرٹس کو صبح کے وقت کافی پیتے ہوئے کہا تھا چونکہ یہ بات مجھے اندر سے مضطرب کیے ہوئے تھی وہ ایک طرف بہت جھکتی جا رہی تھی اس لیے میں نے اُسے سیدھا کر دیا۔

وقتِ مقررہ پر گوبیلا اُن سے ملنے کے لیے آیا۔۔۔گوبیلا ہم سایہ گاؤں کا سردار تھا وہ خاکستری بالوں والا ایک عمر رسیدہ حبشی تھا۔دُبلا پتلا اور سیاہ فام صرف ایک سفید کپڑا اُس نے اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا ہوتا اوایک خارش زدہ پینتھر کی کھال کندھوں سے پشت کی طرف لٹک رہی ہوتی۔وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے لمبے لمبے قدم اُٹھا اور قد کے برابر ایک جریبٹیکتا ہوا آتا اور نشت کے کمرے میں داخل ہو کر دروازے کے بائیں طرف زمین پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔وہ کے اِرٹس کو تکتا جاتا اور ایسی زبان میں باتیں کرتا کہ جو کے اِرٹس نہیں سمجھتا تھا اور۔۔۔کے اِرٹس بھی اُسے روکے بغیر کبھی کبھی پوچھتا رہتا کہ کام کیسا چل رہا ہے کیسے ہو۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اِن دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ اِس دوران جاری رہتا۔۔۔دونوں ساتھی اِس سیاہ فام بڈھے کے لیے اپنے دل میں ایک پسندیدگی رکھتے تھے اِس لیے کبھی کبھی فادر گوبیلا بھی کہہ جاتے۔۔۔گوبیلا کا رویہ بھی مشفقانہ ہوتا یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ ہر سفید فام کو بڑا محترم سمجھتا ہے۔۔۔اُس کے یہ سارے کے سارے غیر ملکی جوان اور ایک جیسے نظر آتے (صرف قد کا فرق ہوتا) اُسے یقین تھا کہ یہ سب بھائی ہیں اور لافانی بھی۔۔۔فنکار کی موت کا اُسے یقین نہیں تھا۔وہ پہلا سفید فام تھا جسے گوبیلا نے قریب سے دیکھا تھا۔اُسے مرنے اور دفن ہونے کے بعد بھی اس کا یقین ذرا برابر متزلزل نہ ہوا اُس کا خیال تھا کہ یہ محض بہانہ ہے۔اس نے بعض پراسرار کاموں کی وجہ سے جسے وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا دفن کرا لیا ہے، یا پھر اپنے گھر واپس جانے کے لیے اُس نے زمین کے اندر اندر سے جانا پسند کیا ہو۔اب یہ دونوں بھی چونکہ اُس کے بھائی تھے اِس لیے گوبیلا کی ساری عقیدتیں اور احترام اِن کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔یہ دونوں بھی اِس کا صلہ دیتے اِس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے کارلیز اُسے تیلیاں جلا جلا کر دکھاتا جو اُس کے لیے زامسرت کا موجب عمل تھا۔کے اِرٹس ایمونیا کی بوتل اُس کے ناک کے ساتھ لگا اوپر سانس کھینچنے کا موقع فراہم کرتا گوبیلا اِن کا اچھا سلوک دیکھ تیقّن کے ساتھ کبھی فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ وہی نہیں یا پھر اُنہیں میں سے دوسرے۔کو بیلا کے ساتھ اِس دوستی کا ہی نتیجہ تھا کہ گوبیلا کے گاؤں کی عورتیں سخت کانٹوں دار لمبی لمبی گھاس میں سے ایک قطار میں چلتی ہوئی آتیں اور چوکی

والوں کے لیے میٹھے آلو، مرغ اور پام کی شراب مہیا کر جاتیں۔اور کبھی کبھار تو بکری بھی دے جاتیں۔۔۔ کمپنی نے چوکی پر متعین سٹاف کے کھانے پینے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی نہ افسران پر نہ کارکنوں پر اور ظاہر ہے وہاں پر رہنے والوں کو کھانے پینے کے لیے تو کچھ چاہیے بہر حال گوبیلا کی طرف سے اُن کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں یہ لوگ کبھی کبھار بیمار پڑ جاتے تو دوسرا خیال رکھتا وہ ذرا کم اِس طرف توجہ دیتے کہ اُن کی صحت شدید موسم اور کم خوراک کی وجہ سے کمزور ہوتی جاتی ہے چونکہ ہر وقت ساتھ رہنے کا ساتھ تھا اِس لیے شکل وجسم میں ہونے والا تغیر کم ہی محسوس ہوتا۔کارلیز کی آنکھوں میں گڑھے پڑ رہے تھے اور وہ بات بات پر غصے میں آنے لگا تھا۔کے اِرٹس تو گول گنبد نما پیٹ دھرا ہوا ایک لٹکتا لمبوترا چہرہ رہ گیا تھا۔اس حلیے میں وہ ایک طلسماتی سی مخلوق معلوم ہوتا۔

پانچ ماہ اِس طرح بیت گئے۔۔۔۔

ایک صبح جب کارلیز اور کے اِرٹس برامدے میں کرسیوں پر نیم دراز آرام کر رہے تھے اور آنے والے سٹیمر کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ افریقی لوگوں کا ایک چھوٹا سا مسلح گروہ جنگل سے نکل کر تیزی سے تجارتی چوکی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔وہ کم از کم اِس علاقے میں کسی اجنبی قبیلے کے لوگ تھے لمبے نحیف ونزار گردن سے لے کر ٹخنوں تک نیلی پٹی دار لباس میں لپٹے ہوئے دائیں کندھے پر توڑے دار بندوقیں بھی لٹک رہی تھیں۔ماکولا نے انہیں دیکھتے ہی تھوڑا سا خیر مقدمی جوش وخروش دکھایا اپنے سٹور ہاؤس (جہاں وہ سارا دن گھسا رہتا) سے دوڑ کر نکلا اور تیزی سے اُن کی طرف بڑھا۔وہ چوکی کے صحن میں آ گئے اور چبھتی ہوئی تحقیر آمیز نظروں سے دونوں کو دیکھتے رہے۔اُن کا لیڈر ایک پختہ کار سرخ آنکھوں والا نیگرو تھا۔اُس نے برآمدے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک لمبی گفتگو کی اُس کی گفتگو میں باتیں کم اور اشارے کچھ زیادہ ہی تھے پھر ایک دم خاموش بھی ہو گیا۔اُس کے لب ولہجہ میں کوئی نہ کوئی ڈرا دینے والی بات ضرور تھی۔اُس کے طویل جملوں کے زیر وبم نے اُنہیں چونکا سا دیا۔ایک ایسا خوف سا دل میں جاگا جیسے وہ کسی شے کو محسوس تو کر رہے ہوں، لیکن پہچان نہ پا رہے ہوں۔۔۔''یہ کون سی زبان ہے'' حیرت میں ڈوبے ہوئے کارلیز نے پوچھا۔یہ تو کوئی بے معنی سی آوازیں ہی تھیں میرے لیے خوابوں کی طرح ناقابلِ شناخت سی زبان تھی۔اُس نے ماکولا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا یہ کون ہیں اور سردار کیا کہہ رہا تھا۔ماکولا جو صحن کے گرم فرش پر کافی دیر سے کھڑا تھا بولا''میں نہیں جانتا'' یہ کہیں بہت دُور سے آئے ہیں شاید مسز پرائس اِن کی بات سمجھ سکتی ہو؟ بہر حال یہ کوئی اچھے آدمی نہیں لگتے۔'' سردار نے غصیلے انداز میں ماکولا سے کچھ کہا ماکولا نے یونہی سا سر ہلا دیا۔وہ جنگلی یوں ہی اِدھر اُدھر تلاش کرنے والی نظروں سے دیکھنے لگا، جونہی اُس کی نظر ماکولا کے جھونپڑے پر پڑی وہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔دوسرے ہی لمحے مسز ماکولا بے تکلفی کے ساتھ فراٹے سے بولتی ہوئی سنائی دی۔یہ تعداد میں کل سات تھے جس دوران اِن کا سردار باتوں میں اُلجھا ہوا تھا یہ سب اِدھر اُدھر بے تکلفی سے ٹہل رہے تھے۔کبھی سٹور روم میں سر ڈال

کر جھانک لیتے کبھی قبر کے گرد جمع ہو کر صلیب کی طرف اشارے کرنے لگتے عمومی طور پر اُن کا رویہ ایک بالکل جانی پہچانی جگہ پر چلنے والوں کا سا تھا۔ ''میں اِن لوگوں کو بالکل پسند نہیں کر رہا'' کے اِرٹس نے پریشان لہجہ کے ساتھ کہا۔۔۔ میرا خیال ہے یہ ساحل کی طرف سے آئے ہیں''۔۔۔ اِن کے پاس بارودی اسلحہ ہے کارلیز نے ذرا دانش ورانہ انداز میں کہا۔ اِن دونوں کو پہلی دفعہ ماحول میں خطرے کی گھنٹی سنائی دی۔ اور وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ تو یہاں اجنبی اور غیر محفوظ ہیں۔ اگر کچھ ہو گیا تو کون اُن کو بچانے آئے گا۔ اِس سوچ سے اضطراب دونوں کے چہروں پر نظر آنے لگا۔ اندر جا کر انہوں نے اپنے ریوالور چیک کیے۔ کے اِرٹس کہنے لگا:

''ہمیں ماکولا سے کہنا چاہیے کہ اِن سے کہہ دے کہ یہ اندھیرا ہونے سے پہلے یہاں سے چلے جائیں۔'' اجنبیوں نے مسز ماکولا کی طرف کھانا کھایا اور پھر بعد از دوپہر چلے گئے۔ یہ عورت کچھ زیادہ ہی پر جوش نظر آئی اُس نے اِن سب کے ساتھ کھل کر باتیں کیں کبھی دریا اور کبھی جنگل اور عقبی گھاٹی کی طرف اشارہ کر کے اپنی گھن گھناتی ہوئی آواز میں بہت کچھ کہتی رہی۔ ماکولا ایک طرف بیٹھا دیکھتا رہا۔ وہ جانے لگے تو اُٹھا اپنی بیوی کے کان میں آہستگی سے کوئی بات کی اور پھر اُن لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے چوکی کی عقبی گراؤنڈ کی طرف تنگ گھاٹی کے پار اُن کو چھوڑنے کے لیے چلا گیا۔ واپسی پر وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم آہستہ آہستہ آتا ہوا نظر آیا۔ جب افسران نے اُس سے گفتگو کی تو کبھی یوں محسوس ہوتا کہ وہ بات سمجھا ہی نہیں کبھی یہ احساس ہوا کہ جیسے وہ فرنچ جانتا ہی نہیں عجیب عجیب لفظ بولنے لگا آخر اِن دونوں نے یہی نتیجہ نکالا کہ دعوت میں پام کی شراب زیادہ ہی چڑھا گیا ہے۔۔۔ اِن دونوں کے درمیان آنکھیں کھلی رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن شام ہونے تک سب کچھ پھر سے اتنا پرسکون اور مانوس ہو گیا کہ وہ دونوں اعصابی لحاظ سے معمول پر آ گئے البتہ رات کو اِدھر اُدھر سے آنے والی ڈرموں کی آوازوں نے اُنہیں بے چین رکھا۔ ایک گہری گھمک والی آواز قریب کہیں سے آتی تو دوسری کہیں دُور سے کھڑکھڑاتی ہوئی آوازیں اُٹھتیں اور وہ ایک دوسرے میں شامل ہوتی جاتیں۔۔۔ تعداد بڑھتی جاتی۔۔۔ یہاں تک کہ یہ پورے جنگل میں پھیل جاتیں یوں ساری رات ہوتا رہا یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری سرزمین ڈرم کی آواز میں اپنی آواز آسمانوں تک پہنچا رہی ہے۔ اچانک اِن بلند ہوتی ہوئی آوازوں کے درمیان چیخیں سی اُبھرتیں جیسے بدروحیں مل کے چیخ رہی ہوں یا ایک پاگل خانے میں بہت سے پاگل مل کر چیخم دھاڑ مچا رہے ہوں۔ یہ چیخیں کچھ ایسی تیز نوکیلی اور چبھ جانے والی ہوتیں کہ انسان کو اندر تک لرزا دیتیں۔

کارلیز اور کے اِرٹس ساری رات نہ سو سکے۔ اِن دونوں کا خیال تھا کہ ہم نے رات اس شور شرابے کے دوران کچھ فائر کی آوازیں بھی سنی ہیں البتہ وہ اِس بات سے متفق نہ تھے کہ یہ فائر کی آوازیں آ کس سمت سے رہی تھیں۔ صبح کو ماکولا کہیں چلا گیا۔ وہ تقریباً دوپہر کو واپس آیا تو کل والے اجنبیوں میں سے ایک اُس کے ساتھ تھا۔ کے اِرٹس کی ساری کوششوں کے باوجود وہ منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔ کارلیز دُور

کہیں دریا کے کنارے بیٹھا مچھلی کا شکار کر رہا تھا واپسی پر وہ اپنا شکار دکھاتے ہوئے بولا اِدھر اُدھر کے حبشی کسی آفت کا شکار ہیں وہ کچھ بے چین سے نظر آتے ہیں میں نے دس پندرہ نوکائیں دو گھنٹوں میں دریا کے پار جاتی ہوئی دیکھی ہیں۔ کے اِرٹس پریشان سا ہو گیا اور کہنے لگا: ''ایک مجھے آج کچھ ماکولا کی بھی سمجھ نہیں آ رہی۔۔۔'' کارلیز نے کہا ہمیں اپنے سارے آدمیوں کو قریب قریب ہی رکھنا چاہیے۔ آثار کچھ اچھے نہیں نظر آ رہے۔

اِس تجارتی مرکز پر کل دس کے قریب کارکن تھے۔ یہ شب روز کی کسی قسم کی گنتی کے بغیر (یہ گنتی انہیں نہیں آتی تھی) کوئی دو سال سے کمپنی کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ یہ اِس دکھی اور غربت کے مارے تاریک براعظم کے دور دراز علاقوں سے اکٹھے کئے گئے تھے۔ اِن کا تعلق آس پاس کے علاقوں کے قبیلوں سے نہیں تھا۔ یہ یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ وہ اِس علاقے میں بالکل اجنبی ہیں اور کسی بھی اجنبی کا علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ سب گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں سٹیشن کی عقبی گھاٹی کی ڈھلوان پر اُگی لمبی لمبی گھاس اور نرسلوں کے درمیان رہتے تھے۔ یہ یہاں اپنی خوشی سے تو نہیں رہ رہے تھے روزگار کی مجبوریاں تھیں اِس لیے اکثر تاسف کے ساتھ اپنے علاقے کے نشاط انگیز جادوٹونوں سے بھرے تہواروں کو یاد کرتے جنہیں وہ اپنے بہن بھائیوں، ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں سے مل کر مناتے تھے۔ ان سرزمینوں کو یاد کرتے جن پر ان کی محبوبائیں چلتی پھرتی تھیں یا اُن کے قابلِ احترام سردار اور جادوگر رہتے تھے۔ چاول کے مٹھی بھر راشن کے علاوہ جو اِن کے اور کمپنی کے درمیان طے ہوا تھا کھانے پینے کی کوئی چیز اِن کو سونگھنے کے لیے بھی نہیں ملتی تھی اِس لیے جسمانی لحاظ سے کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے۔ اگر یہ کسی اور قبیلے سے تعلق رکھتے تو مرنے کو ترجیح دیتے دوسرے بہت سے جنگجو جنگلیوں سے اِن کی اُٹھان ذرا مختلف تھی۔ یہ طبعاً تکالیف بیماریوں اور ناانصافیوں کے باوجود ایک ناسمجھی کی زندگی بسر کرتے چلے جا رہے تھے۔ کے اِرٹس اور اس کا ساتھی حتی الامکان اِن کا خیال رکھتے، لیکن اِن کی سابقہ جسمانی حالت کو واپس لانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ یہ کام بہت کم کرتے وہ ہر صبح گھنٹی کی آواز پر اکٹھے کیے جاتے مختلف کاموں پر لگایا جاتا باڑوں کو درست کرنا، گھاس کاٹنا، کوڑا کرکٹ کی صفائی درخت کاٹنا وغیرہ، لیکن دنیا کی کوئی طاقت انہیں تیزی طراری اور چستی کے ساتھ یہ کام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اِن دونوں سفید فاموں کا اُن پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔

بعد دوپہر کے ماکولا کے اِرٹس کے پاس آیا جو اُس جنگل کے اندر سے دھویں کے تین بلند و بالا مرغولوں کو اٹھتا ہوا پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے ماکولا؟۔۔۔ کے اِرٹس نے پوچھا۔

۔۔۔'' کچھ گاؤں جل رہے ہیں'' لگتا تھا کہ ماکولا اپنے پرانے موڈ میں واپس آ گیا ہے۔ پھر

وہ اِس طرف سے توجہ ہٹا کر بولا ''ہم بہت کم ہاتھی دانت اکٹھا کر سکے ہیں۔ گذشتہ چھ ماہ کے دوران اِس معاملے میں مندا ہی رہا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ تھوڑا سا اور ہاتھی دانت حاصل کر لیں۔'' کے اِرٹس نے کہا ہاں ضرور بالکل کرنا چاہیے، اُس کے ذہن میں اُس اپنے کمیشن کا خیال آ گیا جو اس طرح کچھ اور بڑھ سکتا تھا۔ ماکولا کہنے لگا وہ آدمی جو کل آئے تھے اُن کا تعلق لوانڈا سے ہے اُن کے پاس کافی ہاتھی دانت ہے۔ وہ سارے کا سارا واپس اپنے علاقے میں نہیں لے جانا چاہتے میں اُن سے کیوں نہ خرید لوں۔۔۔ مجھے اُن کے کیمپ کا پتہ ہے۔۔۔ کے اِرٹس نے کہا ضرور خرید لو۔۔۔ وہ کیسے تاجر ہیں۔۔۔'' ماکولا نے لاتعلقی سے جواب دیا کچھ اچھے نہیں لوگوں سے لڑتے ہیں عورتوں اور بچوں کو اُٹھا لیتے ہیں۔۔۔ ملک میں کچھ افراتفری پھیلی ہوئی۔۔۔ اچھا تو خیر میں پھر اُن سے دانت خرید لوں گا۔۔۔ کے اِرٹس کا جواب اثبات میں تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد ماکولا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہنے لگا: ''جناب دیکھئے سٹیشن کی حالت کچھ درست نہیں ڈائریکٹر صاحب ضرور غصے ہوں گے بہتر ہے کہ ہاتھی دانت کی ایک اچھی لاٹ حاصل کر لی جائے۔ کے اِرٹس نے بھی اِدھر اُدھر نظر دالتے ہوئے کہا کیا کروں یہ کاہل میری بات سنتے ہی کب ہیں۔ ہاتھی دانت حاصل کر لو تو اچھا ہے۔ کب تک حاصل کر لو گے۔۔۔'' ماکولا نے جواب دیا بہت جلدی ہو جائے گا شاید آج ہی رات سودا ہو جائے آپ بس اندر رہیں البتہ ایک درخواست کروں گا کہ کارکنوں کو تفریح اور رات کے وقت اپنے تہوار پر ناچ گانا کرنے کی اجازت دے دیں اور اس کے لیے انہیں تھوڑی سی پام شراب مہیا کرنے کی اجازت بھی دے دیں۔ ویسے بھی وہ کافی پڑی ہے اور خواہ مخواہ موسم کی وجہ سے خراب اور کھٹی ہو رہی ہے۔

کے اِرٹس نے اِس کی بات پر ہاں کر دی اور وہ اپنا حصہ اُٹھائے اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں وہاں برآمدے میں شام تک رہے جب یہ دونوں اپنے کمروں میں جانے لگے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور کارکنوں کی جھونپڑیوں کے آگے ناچ گانا کرنے کے لیے الاؤ جل چکا تھا۔ اور اُن کے شور شرابے اور ڈرم بجانے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں گو بیلا کے گاؤں کے کچھ آدمی بھی اِس ہلا گلا میں شریک ہونے کے لیے آ گئے تھے۔۔۔ آدھی رات کے قریب کارلیز کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اُس نے کسی شخص کو زور سے چلاتے ہوئے سنا۔ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ کارلیز باہر کی طرف بھاگا۔ کے اِرٹس اسے برآمدے میں ہی مل گیا۔ وہ دونوں حیرت زدہ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ وہ ماکولا کی رہائش گاہ کی طرف اُسے بلانے کو چلے انہوں نے صحن میں کچھ سایوں کو اِدھر اُدھر آتے جاتے بھی دیکھا اچانک اندھیرے میں آواز آئی مجھ پر گولی مت چلانا یہ میں ہوں پرائس اور اُس کے ساتھ ہی ماکولا اُن کے قریب آ گیا اور تیزی سے دبی ہوئی آواز کے ساتھ کہنے لگا ''واپس جائیں آپ تو سب کچھ برباد کر دیں گے۔'' کارلیز نے کہا۔۔۔ یہاں کچھ اجنبی سے لوگ دکھائی پڑتے ہیں۔ ماکولا کہنے لگا فکر مت کریں مجھے معلوم ہے پھر مزید دبی آواز میں بولا یہ ہاتھی دانت لائے ہیں۔۔۔ آپ چپ رہیں میں اپنا کام اچھی طرح

جانتا ہوں۔۔۔'' دونوں افسران نہ چاہنے کے باوجود اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ لیکن وہ سو نہیں سکے۔ لیٹے ہوئے کمرے سے باہر قدموں کی چاپ اور لوگوں کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں سنتے رہے۔ ایک آدھ دفعہ کسی کے کراہنے کی آواز بھی آئی۔۔۔ یوں محسوس ہوا جیسے کافی سارے آدمی ہیں اور زمین پر کچھ چیزیں دھماکے سے گر رہی ہیں۔ یہ کافی دیر تک ہوتا رہا پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ سٹیشن نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی۔ صبح سویرے کارلیز باہر آیا رات کی بے آرامی ابھی تک خمار کی طرح اُس کی آنکھوں میں تھی باہر صحن میں نکل کر اُس نے گھنٹی کی رسی کو ہلایا ہر صبح گھنٹی کی آواز پر کارکن اکٹھے ہوتے تھے اُس دن کوئی نہ آیا کے اِرٹس بھی جمائیاں لیتا ہوا باہر آ گیا۔ ماکولا اِسی لمحے اپنے جھونپڑے سے ہاتھوں میں صابن ملے پانی کا تسلا اُٹھائے ہوئے اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ ماکولا ایک اور صاف ستھرا رہنیو الا حبشی تھا۔ اُس نے وہ صابن ملا پانی اپنے آوارہ کتے پر انڈیل دیا اور وہیں سے اُن کی طرف منہ کر کے اطلاع دی کہ وہ سارے تو کل رات ہی جا چکے ہیں پہلے تو سفید فاموں کو یوں لگا کہ اُسے بات سمجھ ہی نہیں آئی پھر اچانک حیرانی سے بولے ''کہاں'' اور پھر ایک دوسرے کی طرف بھی سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔ کارلیز بڑبڑایا یقیناً ہم کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں کے اِرٹس نے زیرِ لب کہا ''میں نہیں مانتا'' کارلیز بولا میں خود جھونپڑیوں کی طرف جا کر دیکھتا ہوں۔ ماکولا آہستہ آہستہ چلتا جب کے اِرٹس کے قریب آیا تو کے اِرٹس نے کہا ماکولا میں یہ بات کیسے مان لوں۔ کے اِرٹس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ ''میں تو اُن لوگوں کا پورا پورا خیال رکھتا تھا کبھی بُرا سلوک نہیں کیا۔'' کچھ تذبذب کے بعد ماکولا نے کہا ''وہ تو ساحلی لوگوں کے ساتھ چلے گئے''۔ ''مجھے اس کی پرواہ نہیں وہ کس کے ساتھ گئے'' کے اِرٹس بولا کے اِرٹس پر جھنجھلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔۔۔ ''ناشکرے، وحشی'' اُس کے منہ سے نکلا پھر ایک دم چونک کر شک بھری نظروں سے ماکولا کی طرف دیکھا اور ''تم اِس کے بارے میں کیا جانتے ہو۔۔۔'' اُس نے کندھوں کو لاپروا انداز میں جنبش دیتے ہوئے اور نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے کہا ''میں کیا جانتا ہوں؟ بس میرا خیال ہے۔۔۔ کیا آپ ہاتھی دانت دیکھیں گے؟ یہ ایک بہترین لاٹ ہاتھ آئی ہے آپ نے ایسا ہاتھی دانت پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ سٹور کی طرف چل پڑا۔ کے اِرٹس مشین کی طرح خاموش اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ذہن میں لوگوں کی ناقابلِ یقین بے وفائی کا خیال تھا۔ باہر سٹور کے دروازے کے سامنے چھ زبردست بھاری بھرکم دانت پڑے تھے۔ اُن پر نظر ڈال کر ایک اطمینان بھرے لہجے میں اُس نے پوچھا اِن کی کیا قیمت ادا کی تم نے؟'' ''یہ کوئی باقاعدہ سودا تو ہوا نہیں بس آئے اور دے گئے۔۔۔ میں نے انہیں صرف یہی کہا وہ سٹیشن سے اپنی مرضی کی جو چیز چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ ان کو سامان اُٹھانے والے مزدوروں کی ضرورت تھی اور ہمارے لوگ کوئی اچھے کارکن تو تھے نہیں۔۔۔ کوئی تجارت و جارت نہیں نہ کچھ کتاب میں لکھا پڑھا گیا بس سب کچھ زبانی کلامی ٹھیک ٹھاک طے پا گیا۔۔۔'' کے اِرٹس ایک دم غصے سے پھٹ پڑا۔ ''کیوں آخر کیوں وہ دھاڑا تو نے ہمارے آدمیوں کو اِس ہاتھی

دانت کی خاطر بیچ ڈالا۔'' ماکولا کسی بھی جذبے سے عاری ٹھنڈا خاموش کھڑا ہوا تھا۔ کے اِرٹس ایک دفعہ پھر چیخا تم انسان نہیں شیطان ہو۔۔۔'' ''میں نے کمپنی اور آپ لوگوں کے حق میں جو بہتر تھا وہ کیا'' ماکولا نے بغیر کسی پریشانی اور اضطراب کے جواب دیا۔ ''تم اتنا کیوں چیخ چلا رہے ہو۔ ذرا اِس مال پر نظر ڈالو۔''

''میں تمہیں نکال باہر کروں گا۔ میں تمہاری رپورٹ کروں گا، میں نہیں دیکھتا کوئی مال وال میں منع کرتا ہوں اِنکو ہاتھ بھی نہ لگانا اِن سب کو دریا میں پھینک دو'' کے اِرٹس ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گیا وہ اب ہانپ رہا تھا۔ ماکولا نے بڑے آرام سے لیکن زور دیتے ہوئے کہا مسٹر کے اِرٹس آپ سرخ ہو رہے ہیں اگر دھوپ اور گرمی میں اسی طرح غصہ کھاتے رہے آپ بخار میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور یہ آپ کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔۔۔ پہلے والے چیف کی طرح۔۔۔'' اِس وقت دونوں ایک دوسرے پر نظریں گاڑے اِس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے اندر کچھ ٹٹول رہے ہوں۔ کے اِرٹس ایک لحظہ کے لیے کانپ گیا، لیکن ماکولا کا مفہوم سے غالباً اِس سے زیادہ کچھ نہ تھا جتنا کہ اُس نے کہا۔ لیکن اِس کے الفاظ کے اِرٹس کو اندر سے ہلا ضرور گئے۔۔۔ وہ کچھ ہراساں نظر آنے لگا۔ وہ فوراً مڑا اور اپنے کمروں کی طرف چلا گیا۔ ماکولا بھی اپنے بیوی بچوں کی طرف پلٹ آیا۔ اور ہاتھی دانت دروازے کے سامنے دھوپ میں پڑا قیمتی پتھر کی طرح چمکتا رہا۔ کارلیز برآمدے میں واپس آیا۔ کے اِرٹس نے دبی دبی آواز میں پوچھا کیا وہ سب چلے گئے۔۔۔ تمہیں وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا؟ ہاں بالکل البتہ وہاں پر گبولا کے آدمیوں میں سے ایک مرا پڑا ہے اُس کے جسم پر گولی سے زخم آیا ہے۔ میرا خیال ہے یہی وہ فائر ہے جو گذشتہ رات ہم نے سنا تھا۔ کے اِرٹس نے محسوس کیا کہ اُس کا ساتھی ہاتھی دانت کی طرف حیرت آمیز انداز میں گھور رہا ہے۔ وہ دونوں چپ چاپ وہیں کچھ دیر کے لیے بیٹھے رہے پھر کے اِرٹس نے اپنی ساری گفتگو جو ماکولا کے ساتھ ہوئی تھی کارلیز کو سنا دی کارلیز کچھ بھی نہ بولا چپ ہو گیا۔ دوپہر کا کھانا دونوں نے بے دلی سے اور بہت تھوڑا کھایا خاموشی ایک بوجھ کی طرح انہیں دبا رہی تھی۔ ماکولا نے سٹور کا دروازہ نہیں کھولا۔ اُس نے اپنا سارا دن بیوی بچوں کے درمیان گذارا۔ وہ گھر کے سامنے چٹائی پر دراز لیٹا رہا اور بچے اُس کے اوپر نیچے اُچھل کود مچاتے رہے۔ اور مسز ماکولا حسبِ معمول کھانے پکانے میں لگی رہی۔ دونوں افسران نے شام کے وقت قدرے بہتر طور سے کھایا۔ بعد میں کارلیز پائپ پیتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے سٹور روم کی طرف بھی گیا وہ وہاں پڑے ہوئے ہاتھی دانت کو اِدھر اُدھر سے گھوم پھر کر غور سے دیکھتا رہا پھر ایک آدھ کو پاؤں سے دبا کر دیکھا جو سب سے بڑا تھا اُس کو نوک والی جانب سے اُٹھانے کی کوشش بھی کی۔ واپس آ گیا اور کے اِرٹس کے پاس بیٹھ گیا جو وہاں سے ہلا تک نہیں تھا۔ وہ کے اِرٹس سے کہنے لگا مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ جب انہوں نے تمہاری طرف سے دی جانے والی پام کی شراب ساری کی ساری پی لی اور ٹن ہو گئے تو جنگلی اُن پر جھپٹ پڑے ہوں گے سب سے بُرا تو یہ ہوا کہ گبولا کے کچھ آدمی بھی وہاں موجود تھے وہ بلاشبہ اُن کو بھی ساتھ اُٹھا لے گئے ہیں نشے میں

دھت لوگوں میں سے کم ہی کوئی ہوشیار ہوا جو ہوا اُس کے مقدر میں گولی لکھی تھی۔۔۔ یہ عجیب ملک ہے۔۔۔ اب تم کیا کرو گے۔۔۔'' میرا دل تو اس کو چھونے کو بھی نہیں چاہتا'' کارلیز نے کہا ہاں بات تو غلط نہیں۔۔۔'' کے اِرٹس غصے کو دبانے کی وجہ سے ہکلاتے ہوئے کہا کارلیز! غلامی۔۔۔ ایک۔۔۔ خ ف۔۔۔ خوفناک۔ چ۔ چیز ہے۔۔۔ خوفناک عذاب ہے۔''

کارلیز نے غراتے ہوئے پوری طرح تائید کی۔ اِن کو اپنے لفظوں پر پورا یقین تھا۔ لیکن محسوسات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آوازوں کے اختلاف کا احساس تو ہو سکتا ہے، لیکن محسوسات کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، ہم اشتعال میں بولتے ہیں یا اشتیاق میں ہم جبر اور ظلم کے بارے میں بات کریں یا جرائم کے بارے میں یا پھر قربانی یا ایثار کے بارے میں لفظوں سے پرے کیا ہے ہم بالکل واقف نہیں ہوتے کوئی نہیں بتا سکتا کہ قربانی اور ابتلا کا اصل مفہوم کیا ہے سوائے اُن کے جو اِن کیفیتوں میں سے گذرے ہوں۔

اگلی صبح انہوں نے ماکولا کو صحن میں بڑا مصروف پایا اُس نے وزن کرنے کا بڑا کنڈہ لٹکا دیا تھا۔ کارلیز نے اُسے کام کرتے اِدھر اُدھر ایک دو بار آتے جاتے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ بدمعاش صحن میں کیا کرتا پھرتا ہے۔ کے اِرٹس اور وہ وہیں کھڑے ہوئے دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں ماکولا نے بھی اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جب ہاتھی دانت تولنے والا کنڈہ صحیح میزان میں لٹکایا جا چکا تو ماکولا نے ایک دانت کو اُٹھا کر پلڑے میں رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا وہ بہت بھاری تھا اُس نے بے چارگی سے بغیر کچھ کہے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ دونوں بت کی طرح خاموش کھڑے رہے اچانک کارلیز نے قریب آ کر کہا ''وحشی انسان ایک طرف سے سنبھالو اور دوسری طرف سے خود ہاتھ ڈال دیا یوں دونوں نے اُٹھا کر دانت کنڈے پر رکھا کے اِرٹس پہلے تو بے حس کھڑا رہا پھر'' میں نے کہا تھا'' کہہ کر بے دھیانی میں اپنی جیب سے کاغذ کا مڑا تڑا ٹکڑہ سا نکالا اور ایک پنسل کا ٹوٹا بھی اُسی کے ساتھ لپٹا ہوا تھا ایسے میں اُس نے پشت یوں پھیر لی جیسے کوئی جادوگری کرنا چاہتا ہو اور تیزی سے وہ وزن جو کارلیز نے قدرے بلند آواز سے بولا تھا لکھ لیا۔ جب مال کا تُل تلا ہو چکا تو ماکولا بولا اِس کا یہاں دھوپ میں پڑا رہنا ٹھیک نہیں کارلیز نے کے اِرٹس سے کہا چیف میرا خیال ہے ہمیں اِس خوبصورت لاٹ کو اُٹھا کر سٹور میں رکھنے میں مدد کرنی چاہیے۔ جب وہ یہ سارا کام ختم کرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے تو کے اِرٹس نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے کہا میرا خیال ہے ہمیں اتنا تو کرنا ہی چاہیے تھا۔ کارلیز نے کہا افسوس تو ہے کہ آدمی کمپنی کے تھے اور پھر یہ ہاتھی دانت بھی تو کمپنی کا ہی ہے۔ ہمیں تو کمپنی کی ہر شے کی حفاظت کرنی چاہیے۔'' لیکن میں اس کی رپورٹ ضرور ڈائریکٹر کو کروں گا۔۔۔ کے اِرٹس نے فوراً کہا۔ دوپہر کے وقت انہوں نے خوشدلی سے کھانا کھایا۔ کے اِرٹس کبھی کبھار آہ بھر لیتا البتہ جب بھی اُن کے درمیان ماکولا کا نام آتا تو دونوں دو چار مغلظات ضرور اُس کے نام کے ساتھ چپکا دیتے۔ یہ

سب کچھ وہ اپنے شعور کی تسکین کے لیے کرتے۔ ماکولا نے باقی آدھا دِن گویا چھٹی کر لی وہ دریا پر اپنے بچوں کے ساتھ نہاتا رہا۔

گوبیلا کے گاؤں کی طرف سے اُس دن کوئی بھی چوکی کی طرف نہیں آیا۔ اگلے دن بھی کوئی نہیں آیا یہاں تک کہ پورا ہفتہ گذر گیا گوبیلا کی طرف سے کوئی نہیں پلٹا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سب مرمرا گئے ہیں ادھر زندگی کا کوئی ثبوت نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اصل میں تو وہ سب ماتمی کیفیت میں تھے اُن کا خیال تھا سفید فاموں نے جو اِن جنگجو جنگلیوں کو ہمارے علاقے میں لے کر آنے والے ہیں اپنی جھاڑ پھونک سے ہمارے بندوں کو غائب کرا دیا ہے۔ وحشی اور جنگلی تو جا چکے تھے، لیکن اُن کا خوف اور دہشت ابھی علاقے میں موجود تھی۔۔۔ دہشت باقی رہتی ہے۔۔۔ ایک آدمی اپنے اندر سے محبت کو نکال سکتا ہے، یہاں تک کہ یقین ختم ہوسکتا ہے، لیکن جب تک کوئی زندگی سے چپکا ہے دہشت اُس کے اندر سے ختم نہیں ہوسکتی یہ ایک ایسی پُراسرار چیز ہے کہ جس کی ٹوٹ پھوٹ بھی نہیں ہوتی۔ یہ بہت خوفناک ہے پوری زندگی میں سرائیت کر جاتی ہے یہ خیالات پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہے یہ دل میں سایے کی طرح منڈلاتی رہتی ہے اور مرنے تک لبوں کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔۔۔۔

اعتدال منش بوڑھا گبولا وہ اُن بدروحوں کے حضور مزید قربانیاں پیش کرتا رہا جنہوں نے اُس کے سفید فام دوستوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ اُس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ کچھ نوجوان غصہ ور لوگوں نے جلانے اور مرنے مارنے پر اُکسانا چاہا، لیکن بوڑھے محتاط سردار نے اُن کی بات نہیں مانی شاید وہ نیکی کی طاقتوں کے اُس آنے والے انتقام کو دیکھ رہا تھا کہ جن کو ناراض کیا گیا تھا۔۔۔ ''اِن لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اُس نے کہا۔۔۔ کم از کم اُس وقت تک چھوڑ دو کہ یہ خود زمین کے اندر اُسی طرح غائب ہو جائیں جس طرح کہ اِن سے پہلے والا غائب ہو گیا ہے۔''

کے اِرٹس اور کارلیز زمین کے اوپر ہی رہے، لیکن انہیں محسوس ہونے لگا کہ اب خلا اور وسعت کچھ اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے اور یہ پتھر کی طرح کی تنہائی اور بھی زیادہ بوجھل ہوتی جا رہی ہے پھر اُنہیں یوں بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ کوئی ناقابلِ فہم سی چیز جو اُن کے تحفظ کی ضامن تھی اُن کے درمیان سے غائب ہو گئی ہے۔ گھر کی حوش کُن تمثالیں اپنے جیسے لوگوں کی یادیں نہ صرف کہیں کھو گئی ہیں بلکہ تیز چمکیلے سورج کی روشنی نے تو اُن کو اور بھی دھندلا کر دیا ہے۔ وہ چپ اور وحشت کے ایک سمندر میں گلے گلے تک غرق ہو چکے ہیں۔ یہ بڑی بے زاری اور جھنجھلاہٹ سے بھرپور دن تھے۔ دن ہفتوں میں بدلتے گئے گوبیلا کے لوگ ہرنئے اور پرانے چاند کی رات بے تحاشا ڈرم بجاتے اور چیختے چلاتے لیکن اب وہ چوکی سے دُور ہی رہتے۔ ماکولا اور کارلیز نے ایک نوکا کے ذریعے اُن سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں جواب تیروں کی بوچھاڑ کی شکل میں ملا جس نے انہیں واپس اپنی چوکی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔۔۔ سٹیمر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ پہلے تو وہ اِس کا تذکرہ عام انداز میں کرتے رہے پھر یہ دیری اُن کے اعصاب پر

سوار ہونے لگی۔ معاملہ سنجیدگی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ کم ہو رہا تھا۔ کارلیز نے دریا سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن دریا اتری ہوئی حالت میں تھا اور مچھلیاں کہیں بہت نیچے جا چکی تھیں اور وہ اپنے سٹیشن سے دور کسی اور جگہ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جنگل میں شکار کے لیے گھسنا بھی خطرناک تھا۔ ایک دفعہ کارلیز نے دریائی گھوڑے پر فائر کیا، لیکن اُن کے پاس کوئی بڑی کشتی اُس کو لانے کے لیے نہ تھی اور وہ آہستہ آہستہ ڈوب گیا جب لاش واپس اُبھری تو گوبیلا کے آدمی اُسے کھینچ لے گئے آج ایک قومی تہوار کا دن تھا۔۔۔ لیکن کارلیز غصے اور جھنجھلاہٹ سے بھرا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ملک کو قابلِ رہائش بنانے سے پہلے تمام حبشیوں کو تہ تیغ کر دینا چاہیے۔ کے اِرٹس بیٹھا گھنٹوں خاموشی سے میلی کے پورٹریٹ کو تکتا رہتا۔ اس کی ٹانگوں پر کچھ ورم سا آ گیا جس سے اُس کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ کارلیز کو بخار آنے لگا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا عادت کے مطابق سینہ تان کر چلنا اب اُس کے لیے بھی ممکن نہ رہا تھا۔ پھر بھی ابھی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں بھی اُس کی عمدہ رجمنٹ کے اثرات محفوظ تھے۔ وہ کرخت اور شدید طنز کرنے کی عادت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ انہوں نے ماکولا سمیت بہت پہلے مع اِس آخری سودے کے اپنے اپنے کمیشن کا حساب کر لیا تھا۔ اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اب اِس بارے میں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ کے اِرٹس نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا، لیکن پھر ڈائریکٹر سے خوف زدہ ہو گیا۔ کارلیز نے ایک طنز بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''میں نے اِس سے بھی بڑے بڑے واقعات کو چپ چاپ ہو جاتے ہوئے دیکھا ہے یاد رکھو۔۔۔ وہ تمہارا ہرگز شکر گزار نہیں ہوگا۔ وہ ہم سے یا تم سے زیادہ نیک پارسا نہیں ہے اور پھر ہم خاموش رہے تو اور کون شکایت کرنے والا ہے یہاں۔۔۔'' اب یہ دونوں جانثار دوست سے زیادہ شریکِ جرم ساتھی بن چکے تھے۔ ہر شام اُمید باندھتے کہ کل صبح سٹیمر پہنچ جائے گا۔ لیکن کمپنی کا ایک سٹیمر تو خراب ہو چکا تھا اور دوسرے پر ڈائریکٹر اور اس کا عملہ دوسری زیادہ منافع بخش تجارتی چوکیوں سے مال اکٹھا کرنے گیا ہوا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ کم منافع بخش سٹیشن اور بے کار سا عملہ انتظار کر سکتے ہیں۔

اِس زمانے میں کارلیز اور کے اِرٹس صرف نمک ملے اُبلے ہوئے چاول پر گذارہ کر رہے تھے اور کمپنی، سارے افریقہ اور اُس دن کو کوس رہے تھے جب وہ یہاں آئے تھے۔ اگر انسان جاننا چاہتا ہے کہ کھانے کی ضرورت بھی انسان کو کیسے ایک ہولناک صورتِ حال میں پھنسا دیتی ہے تو اُسے ایسی ہی خوراک کھانے کا تجربہ کرنا ہوگا۔ دراصل اِس وقت اِس چوکی پر سوائے چاولوں اور کافی کے کچھ نہ تھا۔ کافی ان کو بغیر چینی کے پینی پڑتی تھی۔ چینی کی آخری پندرہ ڈلیاں بڑی احتیاط سے کے اِرٹس نے اپنے بکس کے اندر رکھ کر تالا لگا دیا تھا۔ اور ساتھ ہی آدھی بوتل کونیاک شراب کی بھی محفوظ کر لی تھی تاکہ بیماری یا ایمرجنسی کے وقت کام آسکیں۔ اس کا خیال تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کے وقت یہ کم سے کم ذخیرہ بھی فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے اور کارلیز نے بھی اُس کے خیال سے اتفاق کیا تھا۔۔۔ وہ سٹیمر کا انتظار کرتے رہے

اور لمبی لمبی گھاس صحن میں اُگتی رہی۔ گھنٹی خاموش کھڑی رہی اور دن گذرتے گئے۔۔۔

چپ اور تنہائی برافروختہ کرتی رہی۔ جب دونوں آپس میں بولتے تو لہجہ اُکھڑا اُکھڑا اور غراتا ہوا ہوتا۔ چپ رہتے تو تلخی کا احساس اور شدید ہو جاتا۔ ایک دن اُبلے ہوئے چاولوں کا لنچ کرنے کے بعد کافی کا کپ بغیر چکھے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا چھوڑو سب وہموں کو ہمیں کم از کم ایک دفعہ ایک کپ کافی کا تو اچھے طریقے سے پینا چاہیے کے اِرٹس وہ چینی لے آؤ۔۔۔'' کے اِرٹس نے بغیر اُس کی نظروں میں دیکھتے ہوئے کہا کارلیز وہ بیماروں کے لیے ہے۔ کارلیز نے تضحیک کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ''بیماروں کے لیے۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ کیا فضول بات ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ میں بیمار ہوں۔ کے اِرٹس نے کہا دیکھو تم مجھ سے زیادہ بیمار نہیں ہو۔ اور میں اِس کے بغیر گزارہ کر رہا ہوں۔ کارلیز ایک دم بھڑک اُٹھا اور چلایا۔۔۔ او بڈھے خبیث غلاموں کے تاجر میں کہتا ہوں وہ چینی لے کر آؤ'' کے اِرٹس نے فوراً اوپر دیکھا کارلیز کے لبوں پر ایک گستاخانہ ڈھیٹ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اچانک کے اِرٹس کو یوں دکھائی دینے لگا۔ جیسے اُس نے اِس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ تو کوئی بالکل دوسرا شخص ہے کے اِرٹس کے اندر فوراً ایک تند جذبات کا ریلا سا اُٹھا، لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو روکتے ہوئے کہا ''دیکھو کارلیز میں اِس طرح کا بھونڈا مذاق برداشت نہیں کرتا۔۔۔ آئندہ محتاط رہنا۔۔۔'' مذاق کارلیز نے اپنی کرسی پر آگے جھکتے ہوئے کہا ''میں بھوکا ہوں میں بیمار ہوں میں مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ سمجھے۔۔۔ میں منافق لوگوں سے نفرت کرتا ہوں اور تم منافق ہو تم غلاموں کے تاجر ہو۔ میں غلاموں کا تاجر ہوں۔۔۔ مجھے اپنی کافی میں چینی چاہیے کے اِرٹس نے معاملے کو اُلجھنے سے بچانے کے لیے پھر بھی یہی کہا۔۔۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ اس لہجے میں بات کرنے پر معاف کرتا ہوں۔'' ''تم نے کیا کہا۔۔۔ کیا کہا۔۔۔'' کالیئر چلاتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کے اِرٹس بھی اُس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور بھرّاتی ہوئی آواز میں کہا ''میں تمہارا چیف ہوں اور۔۔۔'' کیا چیف یہاں کوئی چیف ویف نہیں کارلیز نے فوراً اُس کی بات کاٹی۔ یہاں صرف میں اور تو ہیں جاؤ پیٹو گدھے جا کر چینی لے آؤ۔۔۔'' خاموش رہو اور اپنی زبان کو لگام دو۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ بدمعاش کہیں کے۔ اچانک کارلیز نے سٹول اُٹھا لیا پیٹو کام کے نہ کاج کے یہ لو۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی سٹول کے اِرٹس کو دے مارا۔ کے اِرٹس تیزی سے میز کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور خوش قسمتی سے سٹول دیوار پر جا لگا۔ کارلیز نے جھپٹ کر اس میز کو الٹنا چاہا جس کے پیچھے کارلیز چھپا بیٹھا تھا۔ کے اِرٹس اُس کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے اُٹھا اور جھکے جھکے انداز میں ہی کارلیز کو کسی سور کی طرح رگیدتا گراتا اور پھلانگتا ہوا کمرے میں گھس گیا اور تیزی سے اندر سے چٹخنی لگا لی فوراً اپنا ریوالور کھینچ لیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اِدھر کارلیز نے اُٹھ کر دروازے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں اور ساتھ ہی ''یاد رکھو چینی لے کر رہوں گا اگر چینی نہ دی تو تمہیں گولی مار دوں گا۔ میں تمہیں دکھاؤں گا یہاں بڑا کون ہے۔ کے اِرٹس نے سوچا یہ دروازہ تو جلدی گر جائے گا اِس لیے وہ کمرے کے واحد چوکور سوراخ کی طرف بڑھا جو

کھڑکی کا کام بھی دیتا تھا وہ اُس پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اب پوری عمارت اُس کے اور کارلیز کے درمیان تھی۔ دوسری طرف کارلیز سے دروازہ نہ ٹوٹا تو وہ چکر کاٹ کر کے اِرٹس کی طرف دوڑا کے اِرٹس نے اُس کے قدموں کی آواز کو اپنی طرف آتے سنا تو وہ بھی بھاگا۔ ریوالور اُس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا اور وہ عمارت کے گرد ہانپتے کانپتے دوڑ رہا تھا اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیا ہو گیا ہے اس نے پسینہ بھری آنکھوں سے سٹور ہاؤس، ماکولا کی جھونپڑی اور دریا کو دیکھا جو تیزی سے آئے اور گذر گئے دوسرے چکر پر وہ دوبارا پیچھے رہ گئے حالانکہ آج صبح سیر کرتے ہوئے تو اُس سے دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا اُس کی کوشش تھی کہ پیچھے آنے والے سے دُور رہوں۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکے پھر اُسے یوں لگا کہ اس سے پہلے کہ یہ تیسرا چکر ختم ہو وہ مر جائے گا۔ اُس نے محسوس کیا کہ بھاری بھرکم قدموں کی آواز پیچھے سے نہیں آ رہی وہ بھی کھڑا ہو گیا وہ رہائش گاہ کے عقب میں تھا اور کارلیز سامنے کی جانب اُس نے کرسی کی چرچراہٹ کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ اس پر ڈھیر ہو گیا ہے۔ اچانک کے اِرٹس کی ٹانگوں نے بھی جواب دے دیا۔ وہ وہیں پشت دیوار سے لگا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اُس کا منہ اندر سے راکھ کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ اور چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ ضرور کوئی خواب ہے فریب ہے۔۔۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔۔۔ کچھ دیر بعد جب اُس کے اوسان ذرا درست ہوئے۔ تو اُس نے سوچا وہ آخر کس بات پر لڑ رہے ہیں۔ کیا صرف چینی۔۔۔؟ لاحول ولاقوۃ۔۔۔ کس قدر بے معنی بات ہے وہ اُسے دے دے گا کیا وہ خود نہیں چاہتا۔ یہ سوچ کر اسے ایک اطمینان اور تحفظ کا احساس ہوا۔ وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مضبوطی سے جم کر کھڑا ہوتا ایک سیدھا سا سوال اُس کے ذہن میں گھس آیا وہ پھر مایوس سا ہونے لگا۔ اُس نے سوچا میں نے اگر اس وحشی سپاہی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو پھر کل بھی یہ یہی کرے گا۔ اور پھر اُس سے اگلے روز اور اگلے روز بھی یہی کچھ دہرائے گا۔ نئے بہانے بنائے گا۔ اور مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔ مجھے اپنا غلام بنا لے گا، ممکن ہے سٹیمر ابھی کئی دن اور نہ آئے اور کون جانتا ہے آئے بھی یا نہیں اِس بات نے اُسے اندر تک ہلا دیا وہ پھر بیٹھ گیا۔ اور نا اُمیدی اور یاس سے کانپنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ اب ہل بھی نہیں سکتا اُس کی آنکھیں کمزوری سے بند ہو رہی تھیں جنہیں وہ پوری قوت کے ساتھ کھلا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے یہ صورتِ حال کچھ ایسی نظر آ رہی تھی کہ جب جینا اور مرنا دونوں ہی مشکل نظر آتے تھے۔ اچانک اسے ایسا سنائی دیا کہ دوسرے نے کرسی چھوڑ دی ہے وہ پریشان ہو گیا کہ اب پھر دوڑنا پڑے گا دائیں طرف یا بائیں طرف؟۔۔۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ وہ ریوالور کو پوری طرح گرفت میں لیے بائیں طرف لپکا عین اسی وقت وہ اُس کے ساتھ شدت سے ٹکرایا دونوں کی چیخ نکل گئی درمیان میں ایک زوردار دھماکا ہوا ایک غراتا ہوا شعلہ بھڑکا اور پھر گاڑھا دھواں کے اِرٹس شعلے کی چمک سے تقریباً اندھا ہو کر پیچھے کی طرف چاروں شانے چت گرا اور یہ سوچ لیا کہ بس گولی لگ گئی اُس نے پورے زور

سے یہ سوچ کر آنکھیں کھولیں کہ دیکھوں دوسرا اُس کے زخمی ہونے پر کس طرح خوش کھڑا ہے۔لیکن اُسے صرف برآمدے کی چھت کا ایک کنارا ہی نظر آیا۔اُسی لمحے رہائش گاہ کے دوسری طرف کسی کے کھڑے قد کے ساتھ گرنے کی آواز آئی۔پھر خاموشی چھا گئی۔۔۔یہ سب کچھ بس ایک لمحے میں ہوگیا۔۔۔اب اُسے خیال آرہا تھا کہ وہ مرا نہیں بس اسے اُٹھتے ہوئے یہی محسوس ہوا تھا کہ اُس کے کندھے کسی زبردست مروڑ میں آگئے ہوں درد کی ایک ٹیس اُٹھی اور پستول اُس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔وہ اب غیر مسلح اور بے یارومددگار تھا۔وہ اِس انتظار میں تھا کہ دیکھو اب قسمت کیا دکھاتی ہے دوسرے آدمی کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔۔۔یہ کوئی اُس کی جنگی حکمتِ عملی تھی یا کیا تھا۔۔۔شاید وہ دبے پاؤں حملہ آور ہو۔لیکن کس طرف سے۔۔۔شاید وہ اس وقت چھپ کر نشانہ لے رہا ہو۔۔۔تکلیف خوف اور ابہام کے ان لمحوں میں اُس نے سوچا کہ مجھے خود اُٹھ کر اپنے مقدر کا سامنا کرنا چاہیے۔اُس نے کروٹ لے کر دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کی اسی طرح دیوار پکڑے پکڑے چند قدم چلا وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔۔۔ اُس کی ہمت جواب دے گئی۔کچھ لمحے وہ اندھیرے میں کھڑا رہا۔پھر اچانک ماکولا ادھر سے ظاہر ہوا اور کہنے لگا مسٹر کے اِرٹس میرے ساتھ آیئے وہ مر چکا ہے۔اُس کی آنکھوں سے یک دم آنسو پھوٹ بہے وہ اونچی اونچی سسکیاں لے کر رونے لگا۔کچھ دیر بعد اُس نے اپنے آپ کو کارلیز کی لاش کے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ماکولا لاش پر جھکا ہوا تھا پھر ماکولا نے اُس کا ریوالور اُسے دیتے ہوئے کہا یہ آپ کا ریوالور ہے۔''ہاں'' کے اِرٹس نے کہا۔۔۔پھر وہ بولا ماکولا تم نے دیکھا وہ مجھے مارنے کے لیے میرے پیچھے دوڑا تھا۔ہاں میں نے دیکھا تھا مسٹر کے اِرٹس۔۔۔یہاں تو ایک ریوالور ہے اِس کا ریوالور کہاں ہے؟ بڑی کمزور آواز میں کے اِرٹس بولا مجھے معلوم نہیں۔۔۔میں جاتا ہوں تلاش کرتا ہوں۔۔۔ماکولا نے سارے برآمدے کے گرد چکر لگایا جبکہ کے اِرٹس چپ چاپ بیٹھا لاش کو تکتا رہا۔ماکولا خالی ہاتھ واپس آیا وہ سوچ میں گم تھا۔تھوڑی دیر اِسی طرح کھڑا رہا پھر مرنے والے کے کمرے میں گھس گیا چند لمحوں بعد ایک ریوالور لیے ہوئے باہر نکلا اور کچھ کہے بغیر ریوالور کے اِرٹس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ایک لمحے کے لیے تو سارا سٹیشن اُس کو اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوا زندگی موت سے زیادہ بھیانک محسوس ہونے لگی اُس نے ایک غیر مسلح آدمی کو قتل کر دیا تھا۔کچھ دیر سوچنے کے بعد ماکولا نے لاش جس کی ایک آنکھ پوری گولی سے اُڑ چکی تھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا یہ ''بخار سے مرا ہے'' !کے اِرٹس نے کسی جذبے سے عاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولا ''ہاں ہاں'' میرا یہی خیال ہے اسے کل دفن کر دیا جائے۔پھر وہ لاش کو الانگتا ہوا اپنی بیوی کی طرف چلا گیا جو اُس کی منتظر تھی۔دونوں سفید اکیلے رہ گئے۔ساری رات کے اِرٹس کرسی پر بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔جذبات کا طوفان اُس کے اندر سے گذر چکا تھا۔ایک تھکی تھکی لیکن طمانیت سے بھرپور کیفیت اُس پر طاری تھی۔وہ دن کے آخری پہر کے مختصر سے وقفے میں خوف اور مایوسی کے گہرے پنسال سے غوطہ لگا کر باہر آیا تھا۔

اب زندگی کا کوئی راز اُس کے لیے راز نہیں رہا تھا۔لاش کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اُس کی ذات پر بڑے راز منکشف ہوئے تھے۔وہ تو اب اپنے آپ سے بھی ماورا ہو چکا تھا۔اس کے پرانے خیالات اعتقادات پسند ناپسند چیزیں جن کا وہ احترام کرتا تھا یا جن کو ردّ کرتا تھا اب اس کے سامنے ایک سچائی کی روشنی میں نہائی کھڑی تھیں۔۔۔وہ قابلِ نفرت تھیں وہ بچگانہ تھیں، مضحک تھیں باطل تھیں، وہ اپنی اس نئی دانش میں مگن تھا۔اچانک ایک اونگھ سی آئی اُس نے خواب دیکھا یا کیا تھا اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ لاش کی طرح فرش پر پڑا ہے اور کارلیز اُس کی جگہ کرسی پر بیٹھا ہے ایک دم کانپ کر وہ چونک اُٹھا۔اسے اپنے زندہ ہونے کا ایک اطمینان بخش سا احساس ہوا وہ سوچنے لگا کہ یہ اس کے ذہن کی چستی تھی جس نے اسے بروقت کارلیز بننے سے بچالیا۔اُس کی خون کی گردش بڑھ گئی دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔یہ شخص کس قدر درندہ تھا اس نے سوچا۔۔۔اس اطمینان پر اُس خیال میں اُس نے منہ سے سیٹی بھی بجائی تھی یا پھر نہیں بجائی تھی۔۔۔ اُسے کچھ غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔وہ سو گیا تھا۔۔۔ہاں شاید یہی ہوا تھا یا پھر یہ صرف اُس کا احساس تھا کافی دھند چھا چکی تھی اچانک دھند میں سے اُسے وسل کی آواز آئی۔وہ کھڑا ہو گیا صبح کے آثار ہویدا ہو رہے تھے کہر بڑھتی جا رہی تھی۔ایک کہر کا طوفان سا آ گیا تھا ٹراپیکل علاقوں کی دھند جو جسم و جاں میں سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوتی ہے ہر چیز کو مکمل طور پر لپیٹ لیتی ہے موت کا باعث بن جاتی ہے___ گاڑھی ___ سفید___ بے داغ اور زہریلی۔وہ کھڑا ہوا ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کے اِس طرح خوفناک انداز میں چیخ ماری کہ جیسے اُسے زندہ دیواروں میں چنا جا رہا ہو۔کہر کے مرغولے ہر طرف لڑھک رہے تھے پھر اچانک دریا کی طرف سے تیز نوکیلی مشتعل خونخوار سی آوازیں ہوا کو چیر کر دریا کی طرف سے آنے لگیں۔ترقی کے اِرٹس کو دریا کی طرف سے بلا رہی تھی۔ترقی اور تہذیب اور ساری مہذب اقدار۔۔۔ معاشرہ اپنے شاہکار کو بلا رہا تھا۔تاکہ اُس کی نگہداری کی جائے اُس کی راہ نمائی کی جائے اُس کے ساتھ انصاف ہو۔۔۔یا سزا دی جائے؟۔۔۔وہ پہلی بار لاش سے جدا ہو کر برآمدے سے باہر آیا کہر کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے چلا۔۔۔ماکولا بھی کمرے سے باہر نکلا پھر اچانک دوڑنے لگا اُس کی نظریں دریا کی طرف جمی ہوئی تھیں سٹیمر سٹیمر وہ چلا رہا تھا۔سٹیمر نے چوکی کے عملہ کو مطلع کرنے کی وسل دی اُس نے کے اِرٹس سے کہا آپ گودی کی طرف جائیں میں گھنٹی بجاتا ہوں۔وہ غائب ہو گیا اور کے اِرٹس چپ چاپ اُلجھا ہوا کھڑا رہا۔اُس نے آسمان کی طرف لڑھکتی دھند کو دیکھا پھر اِدھر اُدھر خالی خالی نظروں سے دیکھا جہاں جہاں دھند لڑھک رہی تھی وہ یوں کھڑا تھا جیسے کوئی مسافر راستہ بھول گیا ہو پھر اچانک اِدھر اُدھر لڑھکتی دھند کے درمیان فاصلے پر سیاہ دھبے کی طرح صلیب کا نشان نظر آیا۔وہ قدم جما کر اُس کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔سارے میں گھنٹی کی پرخروش آواز پھیلی ہوئی تھی۔۔۔مینجنگ ڈائریکٹر گریٹ سویلائزیشن کا سٹیمر گودی پر آ کر رُک گیا۔ڈائریکٹرز زمین پر سب سے پہلے وارد ہوا۔کہر زیادہ سے زیادہ گہری ہو رہی تھی وہ چوکی کی طرف اُترنے لگا۔ڈائریکٹر نے سٹیمر کی طرف منہ کر کے زور سے کہا گھنٹی کی

آواز تو آ رہی ہے لیکن کوئی بندہ بشر نظر نہیں آ رہا ضرور کچھ گھپلا ہے۔ بہتر ہے آپ لوگ جلدی آئیں وہ کنارے کی ڈھلوان سے نیچے اُترنے لگا۔۔۔ نائب اور انجن ڈرائیور اس کے پیچھے تھے۔ جونہی کہر ذرا کم ہوئی انہوں نے اپنے کافی آگے ڈائریکٹر کو جاتے دیکھا۔ اُس نے پھر پکار کر کہا دوڑو ذرا رہائش گاہ کی طرف جا کر دیکھو میں نے اُن میں سے ایک کو دیکھ لیا ہے تم دوسرے کو تلاش کرو۔ ڈائریکٹر نے ایک کو دیکھ لیا تھا لیکن ایسی حالت میں کہ اُس جیسے سرد و گرم دیکھے ہوئے آدمی کا جسم بھی سُن ہو کر رہ گیا۔۔۔ وہ ساکت کھڑے کھڑے اپنی جیب میں سے چاقو ٹٹولنے لگا۔ اِس دوران اُس کی نظریں اوپر صلیب پر ٹکی تھیں جس کے ساتھ ایک چمڑے کے تسمے کے ساتھ کے اِرٹس کی لاش جھول رہی تھی وہ تھوڑی سی اونچی لیکن پتلی اور لمبی قبر پر چڑھا تسمے کو صلیب سے باندھا اور دوسرے سرے کا پھندا بنا کر گلے میں ڈالا اور جھول گیا اُس کے پاؤں کے انگوٹھے زمین سے دو تین اونچے تھے۔ اُس کے ہاتھ سختی سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اٹینشن کھڑا ہوا اُس کا استقبال تو کر رہا تھا لیکن اپنا زرد گال کندھے کی طرف جھکا کر اور دانتوں میں دبی سوجی ہوئی زبان منہ سے نکال کر ڈائریکٹر کے ساتھ مسخری کر رہا ہے۔

☆☆☆

اوریانہ فلاشی/خالد سعید قسط (۸)

ایک مرد

سورما کی داستان اُن عظیم الشان کارناموں پر ختم نہیں ہوتی جو اُسے دنیا کے سامنے منکشف کرتے ہیں۔ دیو مالا اور حقیقی زندگی، دونوں میں عظیم الشان کارنامے محض کسی مہم کی شروعات کو علامت بند کرتے ہیں۔ یہ اُس کے مشن کا آغاز ہوتا ہے۔ اُس کے بعد ہیرو بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ پھر اپنے گاؤں یا معمول کی زندگی کی جانب واپسی، اور پھر آخری مبارزت، جو موت کے پھندے کو پوشیدہ رکھتی ہے اور جس سے پہلے وہ ہمیشہ بچ کے نکلتا آیا ہے۔ عظیم آزمائشوں کا عرصہ بے حد طویل ہوتا ہے۔ شاید سب سے زیادہ کٹھن اور اذیت ناک۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تب سورما کامل طور پر اپنی ذات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اُسے ہتھیار ڈالنے کی ناقابلِ مزاحمت خواہش کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ہر شے اُس کے خلاف سازش کرتی ہے۔ دوسروں کا تغافل، کٹھور تنہائی، اُس کے دکھوں کی وہی یکساں تکرار۔ لیکن حیف ہے اُس پر اگر وہ اس دوسری ابتلا پر قابو نہ پا سکے۔ تف ہے اُس پر اگر وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دے۔ اگر سورما نامساعد حالات سے سمجھوتا کر لیتا ہے یا سر تسلیم خم کر دیتا ہے تو اُس کے تمام عظیم الشان کارنامے جنہوں نے اُسے ایک دنیا کے سامنے منکشف کیا تھا، سعی لا حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کا مشن ناکامی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ خیر تمہاری اُن آزمائشوں کا دوسرا نام بوآیاٹی(Boiati) ہے وہ نرک جہاں تم نے اپنے جیون کے بہترین برس ضائع کیے تھے۔ تمہاری سورمائی ثابت ہوئی اور تمہاری اسطور میں ایک استقلال آیا۔ اور تمہیں بھی اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ایک دائمی مریض ہمیشہ اپنے مرض اور اُس کی علامات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے یا جنگ آزمودہ سپاہی سدا اپنے جنگی تجربات اور کارناموں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور ہمیشہ مخاطب چاہے کوئی ہو، اور موضوع چاہے کیسا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ وہ بات کو ہیر پھیر کر اپنے اُسی مخصوص موضوع پر لے آتا ہے۔ تمہاری یاد بوآیاٹی (Boiati) کا ذکر کرتے ہوئے کبھی نہ تھکتی تھی۔ اور آخر میں جب تمہارے حافظہ میں بم دھماکہ اور ایجینا (Aegina) کے فوجی ٹرائل کے نقوش بھی مدھم پڑ چلے تھے۔ اور بلاشبہ تمہاری اسطورہ زیادہ اہم اور بڑے کارناموں سے بھری پڑی تھی۔ تب بھی بوآیاٹی کا بات تمہارے لیے ایک ناقابلِ علاج مرض کے دُکھ کی مانند تھا، ایک ناقابلِ تحسین فتح کا غرور، جیسے کہ وہاں پر گزارا ہوا وقت تمہارے لیے اُس سے کہیں زیادہ اہم تھا، جو تم نے بدترین تشدد سہتے ہوئے اور پہروں فائرنگ سکواڈ کے ہاتھوں گولی مارے جانے کے انتظار میں صرف کیا تھا۔ تم ہر شخص سے بوآیاٹی(Boiati) کے بارے میں گفتگو کرتے ”کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا۔“ تم اِن باتوں کو اُن لوگوں کے سامنے بھی بار بار دوہراتے، جنہوں نے

نہیں کریں گے اور نہ ہی پھانسی پر لٹکائیں گے؟'' ناممکن جب تک کہ سزائے معطل نہ کیا جائے مگر یہ تعطل کتنے عرصہ کے لیے ہوگا، ایک دن، ایک ہفتہ یا پھر ایک ماہ کے لیے۔ اس خیال آرائی سے تمہیں کوئی مسرت نہ ہوئی۔ جب آپ ذہنی طور پر موت کو قبول کر چکے ہوتے ہو، تو جینے کا کوئی خیال، زیست کا کوئی امکان آپ کے لیے حد درجہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ تم اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے دیوار تک لائے، تا کہ دیوار کے ساتھ کمر کو ٹیک دے سکو۔ تم ایک افراتفری اور گھبراہٹ کے عالم میں دیر تک وہاں پڑے رہے، تمہاری کمر دیوار کے ساتھ لگی تھی اور پاؤں فرش پر پھیلے تھے۔ پھر تم نے اپنے اردگرد دیکھا۔ دروازے کے قریب ایک کاکروچ موجود تھا اور وہ دھیرے دھیرے تمہاری جانب حرکت کر رہا تھا۔ وہ مسلسل تمہاری جانب پیش قدمی کرتا رہا حتیٰ کہ وہ تمہارے پیروں سے ایک فٹ دُور رُک گیا۔ موٹا، کالا بھجنگ، مکروہ۔ تم نے اُسے ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں کو حرکت دی۔ ''چلے جاؤ، دفع دور!'' پھر تمہیں بے حد افسوس اور پچھتاوا ہوا اور تم نے اُسے بڑی محبت سے واپس بلایا ''آجاؤ دوست، آؤ میری جان، آجاؤ۔'' لگتا تھا کہ کاکروچ نے تمہارے من کی بات سن لی تھی وہ جاتے جاتے رُک کر پلٹا اور پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے تمہاری دائیں ایڑی کے قریب رک گیا۔ ''آجاؤ دوست، آگے بڑھو دوست، میرے قریب آجاؤ۔'' تم نے اُسے اور نزدیک آنے کے لیے کہا۔ کاکروچ تمہاری ایڑی سے بچتے ہوئے ایک یا دو انچ آگے بڑھا، پھر اُس نے سمت تبدیل کی اور تمہاری پتلون کی جانب بڑھتا ہوا تمہارے گھٹنوں کے قریب رُکا۔ تمہیں وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان دکھائی دیا۔ تم اُس کا بغور مشاہدہ کرنے کے لیے اُس پر جھکے۔ اُس کی ٹانگیں لمبی اور بالوں بھری تھیں اور اینٹینا کی مانند دو مونچھیں لیکن اُس کے بارے میں سب سے حیرت انگیز شے اُس کے پر تھے۔ اُس کے چمکتے ہوئے سخت اوپری خول کے نیچے چھپے ہوئے خوب صورت پر تھے۔ ارے تو ایک کاکروچ پرواز بھی کر سکتا ہے۔ تم نے اُس کی جانب انتہائی پیار سے اپنے بازو بڑھائے۔ ''پنکھ ہی تیرے اُڑ آرے پیارے'' مگر یہ کوئی ڈرتھا یا شاید شوق پرواز میں کسی نامعلوم وجہ سے کمی تھی کہ اُس نے پرواز سے مطلقاً انکار کر دیا۔ ''اچھا یار، ایک چھلانگ تو لگاؤ، جانی ذرا کود کے تو دکھاؤ۔'' کافی ہچکچاہٹ کے بعد وہ تمہاری ہتھکڑیوں کی زنجیر پر آ گیا، پھر وہ ہتھکڑی پر چڑھا، پھر تمہارے دائیں ہاتھ کی پشت پر آ گیا پھر تمہاری انگلیوں کے جوڑ کے ابتدائی حصے پر آیا۔ یہاں آ کر وہ متذبذب دکھائی دیا کہ کس اور جاؤں، کون سی انگلی پر؟ بالآخر اُس نے پوری سوچ بچار کے بعد انگوٹھے پر آنے کا فیصلہ کیا جہاں غیر متوقع طور پر اُس کا توازن بگڑا اور وہ سر کے بل زمین پر آن گرا۔ تمہاری ہنسی نکل گئی اور اُسے سن کر تمہیں بے حد مسرت محسوس ہوئی۔ کون یہ سمجھنے کی جسارت کر سکتا تھا کہ ان حالات میں بھی تم بے ساختہ انداز میں ہنسنے کی صلاحیت رکھتے تھے؟ اور وہ بھی اس لیے کہ ایک کاکروچ تمہارے انگوٹھے سے گر پڑا تھا۔ تم نے کمال احتیاط اور پیار کے ساتھ اُس کی پشت کو سہلایا، تم نے سوچا کہ ایک کاکروچ کی عمر کتنی ہو سکتی ہے، اور اگر وہ تمہیں فوراً ہی گولی مار کر ہلاک نہ کریں تو تمہیں کب تک اُس کی دلچسپ صحبت میسر ہوگی۔ تم نے حیرت سے یہ بھی سوچا

پہلے ہی یہ قصہ سینکڑوں بار سُن رکھا تھا۔ اور اسے سن سن کر اُن کے کان پک گئے تھے اور وہ اسے مزید ہرگز نہ سننا چاہتے تھے: تم ہر مشن کے آگے اپنی نرک یاترا کی کتھا بیان کرتے۔ تم اِن دہشت ناک اور بدن میں لہو سرد کر دینے والے واقعات سے کس طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور تمہاری حس مزاح اس قدر بڑے المیہ میں سے مضحک اور مسخرانہ عناصر کی کیسے شناخت کرتی۔ یہ میں کبھی نہ جان پائی۔ واحد شے جس کا تم کبھی نہ ذکر کرتے، وہ تمہاری ذہنی شکست تھی جس نے تمہیں بوآئیاٹی (Bioati) آمد سے پہلے ہی بے حال کر دیا تھا۔ تم یہ توقع کر رہے تھے کہ بہت جلد وہ تمہیں گولی مار کر ہلاک کر دیں گے۔ اور تم محافظوں کو بذریعہ فون یہ یاد دہانی بھی نہ کرا سکے کہ ہیززکس (Hazikis) ایسکلی پیس (Asclepius) دیوتا کی خدمت میں مرغ پیش کرے۔

بوآئیاٹی (Boiati) ایتھنز سے تقریباً تیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ اور یہاں سڑک کنارے لگے نشانات اور اشاروں کی مدد سے بآسانی اس کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ لیکن تم نے اِن اشاروں کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ تم خالی نگاہوں سے اسفالٹ کی جانب دیکھتے رہے۔ یکا یک وہ راستہ خاکستری پہاڑیوں کے منظر پر کھلا۔ اور اُس کی مخالف سمت میں واقع دُھند میں ڈوبی ایک عمارت دکھائی دی۔ یہ عمارت بھی ایجینا (Aegina) کی جیل کی مانند تھی۔ وہی چار دیواری، سنتریوں کے لیے برجیاں اور اُن برجیوں پر مشین گنیں نصب تھیں۔ مین گیٹ پر ایک بورڈ نظر آیا۔ جس پر لکھا ''فوجی جیل خانہ بوآئیاٹی'' گاڑی اندر داخل ہو کر ایک کھلی جگہ پر رُکی جہاں ایک ہی قطار میں سبز رنگ کے چھ چھوٹے چھوٹے دروازے لگے تھے۔ فوجی محافظوں نے تمہیں گھسیٹ کر گاڑی سے باہر نکالا اور پھر تمہیں بائیں جانب دھکیلتے ہوئے آخری دروازے تک لائے۔ وہ آپس میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ جسے تم نے کوئی اہمیت نہ دی، پھر انہوں نے تمہیں کسی اناج کے بورے کی مانند اس شدت اور ظالمانہ انداز میں اندر پھینکا کہ تم فرش پر بری طرح پھسلے اور تمہارے سر کی پشت پوری شدت سے ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ تمہاری آنکھوں کے آگے اَن گنت تارے ناچ گئے۔ تمہیں اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر تم نے خود سے سوال کیا: کہ تم کہاں تھے؟ بلاشبہ ایک سیل میں، معمول کے مطابق یہ کمرہ بھی بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی چارپائی، نہ چٹائی اور نہ ہی کوئی چادر یا کمبل۔ اس خلاء میں موجود واحد شے حوائج ضروریہ کے لیے ایک غلیظ اور متعفن بالٹی تھی۔ بہرحال یہ کمرہ کوئی زیادہ تنگ بھی نہ تھا۔ قریب قریب نو ضرب سات فٹ کا اور محافظ؟ یہاں کوئی محافظ موجود نہ تھا۔ بے حد عجیب، کیونکہ فوجی قانون کے مطابق بھی سزائے موت پانے والے قیدی کو کسی صورت تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا لیکن جب تم نیچے گرے تھے تو ایک سیاہ چشمہ لگائے اور بدبو بھرے سانس والے فوجی آفیسر نے کیا کہا تھا؟ ''اب تم اپنے اصلی گھر پہنچ گئے ہو'' اور اُس کے بعد اُس نے ایک اور جملہ بولا تھا ''اگر یہاں سب کچھ تمہارے لیے ٹھیک ٹھاک رہا تو تم یہاں اُس وقت تک قیام کرو گے جب تک کہ سب کچھ بک نہیں دیتے۔'' اس جملے کا کیا مطلب تھا؟ ''اوہ خدا، اس بار بھی وہ مجھے گولی مار کر ہلاک

کہ ایک کاکروچ کو بھی پالتو جانور کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔ جب تم ایک بچے تھے تو تم نے ایک جھینگر کو سدھانے کی کوشش کی تھی اور اس میں تم کامیاب ہوئے تھے۔ تم ایک سرمستی اور سرشاری میں خوشی سے پھولتے چلے گئے۔ تم اُس وقت خود کو کس قدر خوش قسمت محسوس کرتے ہو جب تمہارے ساتھ کھیلنے کودنے اور بات چیت کرنے کے لیے کوئی ایسا ساتھی موجود ہو جو تم پر نہ تو کوئی فتویٰ صادر کرے اور نہ ہی ''غیر محبّ وطن'' ہونے پر لعنت ملامت کرے۔ یہ تم پر خدا کا کرم تھا۔ ایک کاکروچ کے ساتھ تم بلا خوف ذہن میں آنے والی ہر بات کر سکتے ہو، حتیٰ کہ یہ بھی کہ جرأت، خوف سے جنم لیتی ہے۔ یہ کہ گزشتہ چند مہینوں میں تمہیں اکثر خوف کا تجربہ ہوتا رہا ہے اور یہ کہ تمہیں اُس وقت بہت ڈر لگا جب تم نے اپنے سامنے فائرنگ سکواڈ کو دیکھا۔ انہیں تو بلاشبہ یہ قطعاً محسوس نہ ہوا ہوگا لیکن تمہارے لیے اُس وقت خود کو پُرسکون اور دلاور ظاہر کرنا ایک حد درجہ جان جوکھم کا وش تھی اور موٹر لانچ پر تو یہ اور بھی ناقابل برداشت تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے بھی یہ سب کچھ تمہارے لیے ناقابل برداشت تھا اور نصف گھنٹہ قبل اور صرف ایک منٹ پہلے یوں لگتا تھا کہ جیسے تمہیں زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو اور یکا یک اس کی بجائے، اس ننھی مخلوق کے وسیلے، جو کسی اور وقت میں شاید تمہارے لیے کراہت کا سبب ہوتی، تمہیں محسوس ہوا کہ تم زندہ رہنا چاہتے تھے اور تمہیں لگا کہ ''زندگی اک حسیں جسارت ہے۔'' اور یہ کہ تم اس نو ضرب سات فٹ کے کمرے میں جی سکتے تھے اور یہاں اب تمہیں ضرورت تھی، ایک چارپائی، ایک کرسی میز، ایک فلش ٹوائلٹ کی اور سب سے زیادہ اُس ایک محبوب کاکروچ کی اور ممکن ہے تمہیں چند کتابوں، کچھ کاغذوں اور پنسلوں کی ایک جوڑی کی ضرورت ہو۔ اگر انہوں نے تمہیں فائرنگ سکواڈ کے ذریعے ہلاک نہیں کرنا تو! تم یہاں کچھ پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہو اور کچھ نظمیں بھی لکھ سکتے ہو۔ تم بہرحال اس دنیا میں پہلے شخص نہیں تھے جسے زنداں میں جیون گزارنے پر مجبور کیا گیا تھا اور بعض صورتوں میں تو زنداں میں جینا بذاتِ خود ایک مہم اور جنگ بن جاتا ہے۔ آمریتوں کی پیمائش سیاسی قیدیوں کی تعداد سے کی جا سکتی ہے، ڈالی (Dali) جانی، تمہیں اس سے اتفاق ہے؟ تم نے اسے سلواڈور ڈالی (SalvadorDali) کا نام اس لیے دیا تھا کیونکہ اُس کے منہ پر انٹینا نما بال مونچھیں سی لگتے تھے اور تم اُسے اُس وقت تک اس نام سے پکارتے رہے جب تک کہ سیل کے بھاری تالے میں چابی نہ گھومی اور چھ مسلح فوجی تمہارے لیے خوراک لیے نمودار ہوئے۔ ڈالی وہاں انتہائی شائستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں خاموشی سے کھڑا تھا۔ اس کی انٹینا نما مونچھیں نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھیں۔ شاید وہ تمہاری طویل تقریر سے بور ہو کر سو چکا تھا۔ ''او پاپا ڈوپولکیو، ذرا ڈالی کا دھیان رکھنا۔'' ''کس کا دھیان رکھیں؟'' اُس فوجی نے تم سے پوچھا، جس کے ہاتھوں میں تمہارے لیے کھانے کی ٹرے تھی، ''میرا دوست ڈالی'' ''ابے کیسا دوست؟'' ''وہ'' اور تم نے کاکروچ کی جانب اشارہ کیا ''اوہ!'' فوجی نے کہا اور اُس کے چہرے پر تنفر اور کراہت کے آثار نمودار ہوئے اور اُس نے اپنے فوجی بوٹ کو تیزی سے نیچے لا کر اُسے کچل دیا۔ فرش پر اب محض ایک نیم سفید دھبہ باقی رہ گیا تھا۔

تم کہا کرتے تھے کہ تم اُس نیم سفید دھبے سے زیادہ پریشان نہ ہوئے تھے بلکہ فوجی بوٹ کے تلے ڈالی کے اوپری سخت خول ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ تم نے اپنے خیالوں میں اُس کی چیخ سنی۔ جیسے مرتے ہوئے کاکروچ سے دُکھ کی ایک کراہ بلند ہوئی ہو۔ تم نے بتایا کہ تمہیں یوں لگا کہ جیسے اُنہوں نے ایک کاکروچ کی بجائے دو ہاتھوں اور دو ٹانگوں والی مخلوق کو بے دردی سے کچل ڈالا ہو اور اُسے ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے خیال سے تمہاری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یکا یک تمہاری تنہائی کی پُرآشوب آگہی لوٹ آئی، ایک خالی سیل کی بھیانک نمثال، جس میں آرائش کے لیے محض ایک غلیظ بالٹی تھی۔ تم نے بتایا کہ اس احساس نے تمہارے اندر ایک وحشی طیش بھر کر تمہاری سب شکستوں کو بحال کر دیا۔ ''قاتلو، خونیو!'' اس لایعنی چیخ کے ساتھ تم اُس فوجی پر ٹوٹ پڑے اور اپنی آہنی ہتھکڑیاں اُس کے منہ پر دے ماریں۔ کھانے کی ٹرے دیوار سے جا ٹکرائی اور محافظ اپنی پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ پھر تم نے اُن باقی پانچ فوجیوں پر بھی حملہ کر دیا۔ ایک کے پیٹ میں بھرپور لات رسید کی، دوسرے کے پیٹ میں زوردار کہنی اور تیسرے کے ناک پر زوردار گھونسہ رسید کیا اور یہ سب کچھ موسم گرما میں جنگل میں ماچس کی جلتی ہوئی دیا سلائی پھینکنے سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ چند ہی ثانیوں میں وہ تم پر غالب آ گئے اور تمہارا پورا جسم سرخ رنگ کا ایک لوتھڑا بن کے رہ گیا۔ جیل کا کمانڈنٹ بھی وہاں پر آیا۔ پہلے تو شاید غصے میں اُس سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہوا۔ پھر اُسے کن لوگوں نے میرے پاس بھیجا ہے، یہ کون تھا؟ پاگل، وہ بے تکان مسلسل یہ لفظ بولتا چلا گیا، پاگل، پاگل، پاگل! اُس نے اپنی طویل پیشہ ورانہ زندگی ہر قسم کا مجرم دیکھ رکھا تھا لیکن ایسا عفریت اُس کے تجربے میں نہ آیا تھا، جس نے ایک ایسے غریب فوجی محافظ پر حملہ کیا تھا جو اُس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اور اُس بے چارے فوجی کا جرم ہی کیا تھا؟ اُس نے محض ایک کاکروچ کو ہلاک کیا تھا۔ اُس نے تو تمہارے لیے کمال مہربانی سے کام لیا تھا۔ لہٰذا ای۔ ایس اے کے لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ تم ایک وحشی جانور ہو اور تمہارے ساتھ سخت ترین سلوک روا رکھنا چاہیے اور تم پر وہ نظام آزمانہ چاہیے جس کے تحت چڑیا گھر میں وحشی درندوں کو سدھایا جاتا ہے، گو وہ ذاتی طور پر تھرڈ ڈگری کے ان طریقوں کے استعمال کے خلاف تھا لیکن یہ کہ اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ تمہارے سلسلے میں اُن کے پاس کوئی اور چارہ نہ رہا تھا اگرچہ تمہارے سلسلے میں اُسے سخت احکامات ملے تھے کہ تمہیں کسی طرح کی سہولت مہیا نہ کی جائے مگر اس نے اپنے طور پر تمہیں بعض سہولتیں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اَب اُس نے ان احکامات کی مطابقت میں تمہیں ہر طرح کی عفریت کا سزاوار ٹھہرایا تھا۔ اب اُس نے تمہیں چارپائی مہیا نہ کی، نہ اخبار نہ کاغذ یا پن وغیرہ۔ اُس نے احکامات پر اُن کی پوری روح کے مطابق عمل درآمد کیا تھا۔ ٹارچر کی ہر قسم کو تمہارے لیے روا رکھا گیا۔ نہ ہی کھلی فضا میں چہل قدمی کی اجازت، نہ ہی عزیزوں دوستوں سے ملاقات کی صورت اور تمہارے لیے دن میں چوبیس گھنٹے ہتھکڑی لگانے کا حکم تھا کیونکہ اگر تم ہتھکڑی سمیت فوجی محافظوں کو زخمی کر سکتے تھے تو اگر تمہارے ہاتھ آزاد کر دیئے جائیں تو تم کیا قیامت برپا کرنے کے اہل ہو گے۔ تم نے بظاہر اُس کے

اعلانات کو ایک لاتعلقی کے ساتھ سنا، مگر درحقیقت اُس کے ہر جملے اور لفظ کو پوری احتیاط اور توجہ سے سنا اور انہیں پورا وزن دیا۔ اگر وہ انضباطی اقدامات کا اعلان کر رہا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سزائے موت پر عمل درآمد نہیں کر رہے اور آج کے دن کے لیے سب سے اہم بات یہی تھی۔ کل باغ عدن کا باسی کوئی اور بزرگ تمہاری مدد کرے گا لیکن کل تو ہمیشہ ایک اور دن ہوتا ہے۔

کل اس وقت ایک اور دِن نہیں ہوتا۔ جب آپ کے وجود کے بارے میں کوئی شے بھی انسانی نہ رہے۔ تم یہاں تقریباً ایک ماہ رہے اور تم پر وہ لمحات بھی آئے کہ جب تم موت اور زندگی کے درمیان اعتبار کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ تمہارے جیون کا انحصار محض سانس کی آمد و رفت پر تھا۔ سب سے پہلے تو سیل، یہ ایک سرد اور سیلن زدہ کمرہ تھا کیونکہ انہوں نے تمہیں چولہا بھی نہ مہیا کیا تھا اور اس میں بے تحاشا تعفن اور بدبو تھی کیونکہ رفع حاجت کے لیے محض ایک غلیظ بالٹی مہیا کی گئی تھی اور اُسے بھی دو دنوں کے بعد خالی کیا جاتا تھا۔ جب فوجی محافظ اندر داخل ہوتے تو وہ یا تو اپنا سانس روک لیتے اور یا پھر وہ اپنے منہ اور ناک کو رومال سے دبا کر بند کر دیتے اُن اک رنگ نیلا پڑ جاتا اور وہ سانس بند کیے باہر دوڑتے ہوئے جاتے اور باہر الٹی کر دیتے۔ تم تو اس بدبو کے عادی تھے، لیکن جب کبھی دروازہ کھلتا اور تازہ اور خالص ہوا کا ایک جھونکا اندر آتا، تو تمہیں اس تضاد کا احساس ہوتا اور بعض اوقات تم پر متلی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور تم خوراک کا کوئی ایک لقمہ بھی نگلنے کے قابل نہ رہتے۔ چارپائی کی عدم موجودگی نے تمہاری اذیت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگرچہ ای۔ایس۔اے کے ہیڈ کوارٹرز اور ایجینا (Aegina) میں بھی حالات اور سہولیات ایسی ہی تھیں۔ مگر یہاں تم ذہنی طور پر خارش زدہ کتے کی مانند فرش پر سونے کے لیے ہرگز آمادہ نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ فرش برف کی مانند یخ تھا اور سیلن زدہ ٹائلوں پر کائی جمی تھی اور اس ساری صورت حال سے تمہارے دائمی زکام اور کھانسی کے علاج میں کسی طرح کی مدد نہ مل سکتی تھی اور تمہارے پاس سونے کے لیے کوئی تکیہ بھی نہ تھا۔ ''مجھے کم از کم ایک تکیہ تو مہیا کر دو۔'' تم نے چلا کر کہا لیکن کمانڈنٹ پیٹسورا کوس (Patsourakos) نے اس خوف کے پیش نظر سنی اَن سنی کر دی کہ کہیں اُس کے حکام بالا اُس پر تم سے نرم سلوک کرنے کا الزام نہ لگا سکیں۔ تم اپنی جیکٹ کو گول کر کے تکیے کی جگہ پر استعمال کرتے اور جیکٹ کے بغیر تمہارا جسم سردی سے سُن ہو جاتا۔ سردی سے بچنے کے لیے تم فرش سے اُٹھ کر مسلسل آگے پیچھے چلنا شروع کر دیتے لیکن کچھ دیر کے بعد جب تمہاری ٹانگیں اکڑ جاتیں تو تمہیں یا تو پھر ننگے سرد فرش پر لیٹنا پڑتا یا پھر تم دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ جاتے اور جب یوں اس حال میں بیٹھے تم سورج کے نمودار ہونے کے منتظر ہوتے تو ساتھ ہی ساتھ تمہارے دانت سردی سے بج رہے ہوتے، بات یہ نہ تھی کہ تم سورج کو دیکھ سکتے تھے انہوں نے کھڑکی کو ایک موٹے گتے سے ڈھانپا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود تم اُس کی گرمائش کو محسوس کر سکتے تھے اور خوراک کے مقابلہ میں تم اس موت کے زیادہ بے صبری کے ساتھ منتظر ہوتے۔ تمہیں خوراک کی کوئی زیادہ پرواہ اس لیے بھی نہ تھی کیونکہ فرش پر پڑے کی موجودگی کے نظارے سے تمہیں

ابکائی آتی کیونکہ ہتھکڑیوں سمیت کھانا کھانا ایک کٹھن کار تھا۔ ہتھکڑیاں! یہ ہتھکڑیاں بھی ایک ناقابل برداشت اذیت کا کارن تھیں۔ اب بھی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ پہلے دن تمہارا خیال تھا کہ وہ تمہاری ہتھکڑیاں اُتار دیں گے کیونکہ جیل کے قواعد میں یہ بات شامل ہے کہ وہ جیل کے اندر قیدی کو ہتھکڑیاں پہننے پر مجبور نہیں کرتے، بلاشبہ اُن سے سہو ہوا ہے اور وہ میری ہتھکڑیاں اتارنا بھول گئے ہیں اور جب فوجی محافظ، غلیظ بالٹی کو گند سے خالی کرنے آیا تو تم نے اُس کے آگے اپنے ہاتھ ہتھکڑیاں کھلوانے کے لیے پھیلا دیئے۔ ''ہتھکڑیاں، ابے او پاپاڈوپولکی، تم میری ہتھکڑیاں اتارنا بھول گئے ہو۔'' لیکن فوجی محافظ نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب اس واقعہ کو تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا تو تمہارے سامنے کمانڈنٹ پیٹسورا کوس (Patsourakos) نے وضاحت کی کہ حکام بالا نے تمہاری ہتھکڑیاں نہ اُتارنے کے بارے میں ایک واضح اور سخت حکم دیا تھا اور مجھے، بہرحال اُن کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف بیس منٹ کے لیے تمہاری ہتھکڑیاں کھولتے تاکہ تم رفع حاجت کے لیے غلیظ اور متعفن بالٹی کو استعمال کر سکو اور یہ بیس منٹ کبھی اُس وقت سے ہم آہنگ نہ ہوتے، جب واقعی تمہیں حوائج ضروریہ محسوس ہوتیں۔ یہاں پتلون اُتارنے کا عمل جمناسٹک کی نازک اور پیچیدہ مشق کی مانند ہوتا، وہ زنجیر جس سے دونوں آہنی کڑے جڑے ہوتے، پیمائش میں تیس سنٹی میٹر تھی اور جہاں تک اُن آہنی کڑوں کا تعلق ہے وہ اس قدر تنگ اور کسے ہوئے ہوتے کہ مسلسل تمہاری کلائیوں سے رگڑ کھاتے اور اُن زخموں سے پیپ اور خون رستا رہتا۔

اور اِن سب کے باوجود یہ ابتلائیں تمہارے لیے کسی طیش یا دکھن کا باعث نہ تھیں۔ یہ تو تنہائی اور اکلاپے کا دُکھ تھا تمہیں جیل کی چار دیواری سے پرے یا سیل کی باہر کی دنیا کی بھنک بھی نہ پڑ سکتی تھی۔ تمہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ جیل میں کتنے قیدی بند ہیں یا یہ کہ تم سے اگلے سیل میں کون سے قیدی ہیں۔ وہ لوگ جنہیں تمہیں دیکھنے کا موقع مل سکتا تھا، یا تو وہ مسلح محافظ ہوتے جو تمہارے لیے خوراک کی ٹرے لاتے اور یا پھر وہ فوجی محافظ، جو گندی بالٹی کو خالی کرنے کے لیے آتے اور چاہے تم انہیں پچکارو یا اُن کی مٹی پلید کرو، وہ کسی صورت تم سے بات نہ کرتے۔ انہیں تم سے کسی طرح کی گفتگو کرنے سے سختی سے منع کیا گیا تھا اور اپنی آواز کے علاوہ کوئی اور صدا سننے کے لیے تمہیں جیل کی کسی لڑائی جھگڑے یا کسی گیت کی مدہم گونج کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس دائمی تنہائی نے تمہارے اعصاب کو قریب قریب کچل کے رکھ دیا تھا اور بعض اوقات تم ایک نوسٹالجیا کے احساس کے ساتھ ایجینا (Aegina) کی تفتیش کے دنوں کو یاد کرتے۔ تم کیا کرتے تھے، موت کا سامنا کیا جا سکتا ہے، ہر طرح کے تشدد کو سہا جا سکتا ہے مگر خاموشی کو برداشت کرنا ممکن نہیں۔ ابتدا میں تو یہ آپ کو زیادہ ضرر رساں نہیں لگتی بلکہ اس کے برعکس یوں لگتا ہے کہ جیسے ذہن سے دھند چھٹ گئی ہو، لیکن جلد ہی تمہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ خاموشی میں تم نہ صرف کم سوچتے ہو بلکہ بدتر سوچنے لگتے ہو، کیونکہ جب آپ کا دماغ حافظہ کے علاوہ کسی اور شے پر انحصار نہ کرے تو وہ اپنے اندرون سے خالی ہونے لگتا

ہے۔ایک انسان جو کسی دوسرے شخص سے مکالمہ نہ کرے اور نہ ہی دوسرا اُس سے بات چیت کا روادار ہو ایک ایسی جھیل کی مانند ہو جاتا ہے جس میں کسی اور چشمے کا پانی نہیں گرتا۔ دھیرے دھیرے اس کے پانی کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے اور اس میں ایک جوہڑ کی سی سڑاند پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر اُس کا رہا سہا پانی بھی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ جب کبھی تمہیں موقع ملتا، تم دیوار پر لگے ہوئے ایک دھبے سے بات کرتے دیوار پر لگا ایک دھبہ آپ کو عمدہ صحبت مہیا کر سکتا ہے کیونکہ یہ متحرک ہوتا ہے، اس کا خاکہ کبھی ایک سا نہیں رہتا، وہ مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے، اس سے کبھی تمہیں ایک شے ملتی ہے، کبھی دوسری شبیہہ، پھر ایک چہرہ، پھر ایک جسم، شاید کسی دوست کا چہرہ، یا کسی ایسی عورت کا جسم کہ جس کے تم آرزومند ہو اور اُس سے تم اُسی طرح گفتگو کرتے ہو جیسے ایک کاکروچ سے لیکن اگر تم اس کے بارے میں سوچنے لگو، تو تمہیں ایک واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ دیوار پر دھبہ اور کاکروچ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جب تم نے ان کا موازنہ کرنے کی کوشش کی، تو تمہارا جی بھر آیا۔ ڈالی تمہارا محبوب اور دوست تھا اور اُس سے ہمیشہ کے لیے جدائی نے تمہیں ایک گہرے اور دکھ دائمک اداسی کے کنویں میں ڈال دیا کہ جس سے نکلنے کی شاید کوئی صورت باقی نہ رہی تھی ''دکھ کے دن آب بیتت ناہیں'' ڈالی ہائے ڈالی، ڈالی سے اِس لمبی اور کالی جدائی نے تمہیں اس قدر متاثر کیا کہ تمہیں اپنی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ ایک نارمل انسان کا اپنے کتے، بلی یا کسی اور پالتو جانور کی ناوقت موت پر گریہ اور آہ و بکا بالکل جائز ہے لیکن ایک کاکروچ کی موت پر اس قدر جذباتی ہونا بالکل عجیب بات ہے مگر ڈالی ہائے ڈالی۔۔۔ پھر تم نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے سوچا کہ جہاں ایک کاکروچ ہوگا، وہاں کوئی دوسرا بھی ضرور ہوگا کیونکہ کوئی بھی جاندار کبھی اکیلا نہیں رہتا لیکن تمہیں پوری تلاش کے باوجود کچھ بھی نہ ملا، البتہ تمہیں بیضوی شکل کی چھوٹی چھوٹی کچھ گولیاں دکھائی دیں اور یہ تمہارے خیال میں کسی چوہے کی مینگنیاں تھیں۔ اس سے تمہارا حوصلہ بحال ہوا۔ تمہیں ایک چوہے سے مل کر بے حد خوشی ہوتی۔ تم ایک کاکروچ کے مقابلہ میں اُس کی صحبت سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ چوہیا، ذہین اور حسین ہوتی ہے اور اُسے بآسانی سدھایا جا سکتا ہے مگر یہ ''سندر سپنا'' بھی بہت جلد ٹوٹ گیا۔ دراصل یہ کسی چوہیا کی بجائے کسی مکڑی کی مینگنیاں تھیں لیکن یہاں دُور دُور تک کسی مکڑی کا وجود بھی نہ تھا، کچھ بھی نہیں، اس سیل کے اندر کسی اور ذی حیات شے کا شائبہ تک نہ تھا۔ صرف خاموشی، ایک سکوت۔ یہ امر فطری ہے کہ اگر انہوں نے تمہیں کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار مہیا کیا ہوتا، تو خواندگی کے عمل نے تمہارے دماغ کو فعال کرنے میں مدد دی ہوتی۔ ایک لکھے ہوئے لفظ سے مکالمہ، کوئی بھی مکالمہ نہ کرنے سے تو بلاشبہ بہتر ہوتا۔ لیکن ہر طرح کی پابندیوں کے ساتھ پراسرار ڈی بریفنگ چلتی رہی اور اس سے محض خاموشی، یکسانیت اور بوریت کی پرورش ہوتی رہی۔ بوریت! جب آپ کو ایک تنگ چار دیواری میں ایک بدبو بھری بالٹی کے ساتھ بند کر دیا جائے اور وہاں کسی طرح کی خوشبو کا گزر نہ ہو، تو آلکسی بھی ایک اذیت بن جاتی ہے۔ ایک پل کی گزران برسوں پر محیط لگتی ہے اور آپ وقت کی حِس بھی کھو بیٹھتے ہو۔

اب تمہارے پاس وقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا۔ تمہارے پاس کوئی گھڑی یا کلاک نہ تھا۔ گرفتاری کے وقت سرکاری قبضہ میں لی جانے والی تمہاری ذاتی رسٹ واچ فوجی حکام اور تفتیش کاروں نے تمہیں واپس نہ کی تھی اور یہاں تم پر ایسے لمحات بھی آتے تھے کہ جب تمہیں یہ تک نہ پتہ چلتا تھا کہ صبح کا وقت ہے یا شام کا۔ وقت تمہارا ایک ناقابل علاج ''وسوسہ'' بن گیا تھا۔ تم مسلسل اپنے آپ سے گویا ہوتے ''اِس وقت صبح، دوپہر، شام یا رات کے کتنے بجے ہوں گے؟'' ای ایس اے کے ہیڈ کوارٹرز میں تم نے اپنے آپ سے وقت کے بارے میں کبھی نہ پوچھا۔ وہاں جب وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے کہتے کہ اب صبح کے نو یا سہ پہر کے پانچ بجے ہیں تو تم اسے سُن لیتے تم نے فوجی ٹرائل کے دوران بھی کسی سے وقت کے بارے میں نہ پوچھا۔ لیکن بوآئیاٹی (Boiati) میں وقت کو جاننے کے تجسس نے تمہیں تشنج کی طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ ولد الحیض اور حرامی الدہر تمہیں کبھی نہ بتاتے۔ ''اب کیا وقت ہے؟'' چپ۔ ''مجھے بتاؤ! اس وقت دن یا رات کے کتنے بجے ہیں؟'' خاموشی۔ یوں لگتا تھا کسی نے اِن کی زبانوں کو کاٹ کر کہیں پھینک دیا ہو لیکن اس سے بھی بدتر یہ امر واقعہ تھا کہ اب تمہیں دنوں، ہفتوں اور مہینوں کا اندازہ بھی نہ رہا تھا۔ بوآئیاٹی (Boiati) میں آمد کے بعد جب پہلے پہل اندھیرا چھایا تو تم نے دروازے پر ناخن سے کھرچ کر ایک نشان بنایا لیکن آٹھویں کھرچن کے بعد تم بُری طرح بیمار پڑ گئے اور کوئی نشان نہ لگا سکے۔ ''آج کیا دن ہے؟'' خاموشی۔ ''یہ کون سا مہینہ ہے؟'' خاموشی۔ تم شدید غصے میں آ کر بے کار چلاتے ''یسوع کے لیے، مجھے جواب دو، تمہیں اتنی سی بات بتانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟'' خاموشی۔ جب تمہارا خیال تھا کہ اب تک کم از کم تین ماہ گزر چکے ہوں گے تو محض ایک اتفاق سے تمہیں پتا چلا کہ ابھی تو صرف ایک ماہ ہی گزرا تھا اور یہ وہ دن تھا جب وہ تمہیں پہلی بار سیل سے باہر لائے تھے۔ ''باہر آؤ، پانا گاولس! باہر!'' ''یہ کیا ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ''ملاقات'' ''مگر کون ہے؟'' ''ابھی تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ سورج کی تیز و تند روشنی میں آنکھیں چندھیائے اور ایک عالم ناتوانی میں تم بمشکل گھسٹتے ہوئے کمرہ ملاقات تک پہنچے اگر یہ ملاقاتی تمہاری ماں ہو تو؟ تم نے اُسے تقریباً دو برس سے نہ دیکھا یعنی اُس دن سے جب تم فوج کو چھوڑ بھاگے تھے۔ یہ واقعتاً تمہاری ماں ہی تھی۔ وہ اپنے اَیتوار کے کوٹ میں ملبوس یہاں کھڑی تھی۔ اُس نے اپنے سر پر ایک چھوٹی سی پگڑی باندھ رکھی تھی اور وہ ایک دیہاتی عورت لگ رہی تھی جس نے چھٹی کے دن کا لباس پہن رکھا ہو لیکن وہ تمہیں دیکھ کر نہ تو خوشی ہوئی اور نہ ہی اُس نے تمہاری بلائیں لیں۔ وہ تم سے دُور کہیں اور دیکھ رہی تھی۔ تم نے جنگلے کے قریب پہنچ کر اُسے پکارنے کی کوشش کی لیکن فرط جذبات سے تمہارا گلا رندھ گیا اور تمہارے لب نہ ہلے۔ تم نے کھنکار کے اپنا گلا صاف کیا اُس نے پلٹ کر سرسری نگاہ سے تمہیں ایک لحظہ کے لیے دیکھا لیکن اُس کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہ تھی اور پھر دوبارہ کہیں اور دیکھنے لگی۔ چند لمحات کے انتظار کے بعد اُس نے شدید غصے میں فوجی محافظوں کو مخاطب کر کے کہا ''خیر، تم اُسے یہاں لا رہے ہو یا نہیں؟''

''بی بی، وہ یہیں تو موجود ہے کیا تم اسے نہیں دیکھ سکتیں؟'' اُس نے پھر تم پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، اُس کی آنکھیں کسی ایسے شخص کو تلاش رہی تھیں جسے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا مگر جو یہاں موجود نہ تھا۔ وہ سپید ڈھانچہ جس کی آنکھوں میں گہرے گڑھے تھے اور جس کی بے حد دبلی کلائیوں میں ہتھکڑی پڑی تھی، کسی بھی صورت تمہارے اصل خدوخال سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ''نہیں، بالکل یہ وہ نہیں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟'' تب تم نے اپنی رہی سہی توانائیاں مجتمع کر کے ایک مدہم آواز میں کہا ''میں یہیں تو ہوں اماں'' اور فوراً ہی ایک بلند اور کربناک چیخ نے پورے کمرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ''قاتلو! تم نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا ہے، خونیو؟'' تمہیں کبھی اس بات پر یقین نہ آ سکتا تھا کہ تمہاری ماں یوں چیخنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ تم نے اُس کی پلکوں پر کبھی آنسوؤں کا ایک قطرہ تک نہ دیکھا تھا لیکن آج وہ بے طرح رو رہی تھی اور اُسے گفتگو کے قابل ہونے کے لیے پُرسکون ہونے میں کچھ وقت لگا اور تب تمہیں یاد آیا کہ کسی اور آواز کو سننا کس قدر حسین اور دلکش تجربہ ہوتا ہے۔ بے شک، اُس کے پاس تمہیں بتانے کے لیے بہت سی اہم خبریں تھیں۔ اُسے اور تمہارے باپ دونوں کو فوجی جنتا نے گرفتار کر لیا تھا، کیا تمہیں یہ خبر تھی؟ اُنہیں چوبیس نومبر کو گرفتار کیا گیا تھا اور تب بھی اُس کی طبیعت ماندی تھی اور پھر ایک سو تین دنوں کی اذیت نے اُسے بے حال کر دیا تھا لیکن تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اب اُس کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ تمہارے باپ کو یہ بھی علم نہیں کہ تم فوجی جیل خانے میں ہو، اُسے یہ بھی پتہ نہیں کہ تم پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور یہ کہ اُس نے جان بوجھ کر اُسے پوری صورت حال سے بے خبر رکھا۔ جہاں تک سزائے موت کا تعلق ہے فی الحال اسے معطل کر دیا گیا ہے البتہ تین برس کے عرصہ میں کسی وقت بھی اس پر عمل درآمد ہو سکتا ہے لیکن یہاں ہر شخص کو یقین ہے کہ آئیونیڈیز (Ioannidis) کے اصرار کے باوجود پاپاڈوپاولس (PapaDopoulos) تمہیں فائرنگ سکواڈ کے ذریعے ہلاک کرنے کا خطرہ مول نہ لے گا۔ پورے یورپ میں لوگ تمہارے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں، تم ایک علامت بن چکے ہو۔ تمہارا نام ہر شخص کے لبوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بالآخر اُسے یہاں آ کر تم سے ملاقات کی اجازت دے دی ہے اور اس صبح سے پیٹسوراکوس (Patsourakos) نے اُسے تمہارے لیے کھانے پینے کا سامان لانے کی اجازت بھی دے دی ہے، بالخصوص پرسوں سے۔ تم نے ایک بے تابی کے ساتھ اُس کی بات میں مداخلت کی۔ ''اماں آج کیا دن ہے؟'' ''بچے تمہیں آج کی تاریخ کا بھی علم نہیں؟ بھئی یہ تئیس (۲۳) دسمبر ہے اور پرسوں کرسمس ہے۔'' ''کرسمس! تمہارا مطلب ہے مجھے یہاں آئے صرف ایک مہینہ ہی ہوا ہے۔'' ''ہاں میرے بچے تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔''

☆☆☆

غزلیات

رسا چغتائی

کہاں جاتے ہیں آگے شہرِ جاں سے
یہ بل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے

وہاں اَب خواب گاہیں بن گئی ہیں
اُٹھے تھے آب دیدہ ہم جہاں سے

زمیں اپنی کہانی کہہ رہی ہے
الگ اندیشۂ سود و زیاں سے

اِنہیں بنتے بگڑتے دائروں میں
وہ چہرہ کھو گیا ہے درمیاں سے

اُٹھا لایا ہوا سارے خواب اپنے
تری یادوں کے بوسیدہ مکاں سے

میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا ہوں
کہ باتیں کر رہا ہوں آسماں سے

وہ اِن آنکھوں کے محرابوں پہ ہر شب
ستارے ٹانک جاتا ہے کہاں سے

رسؔا اِس آبنائے روز و شب میں
دمکتے ہیں کنول فانوسِ جاں سے

ارشد ملتانی

محبتوں سے مجھے منزلیں بلاتی ہیں
ہوائیں راہ میں میری دیئے جلاتی ہیں

ترے جمال کا جب آفتاب چھپتا ہے
سکوت شام کی نبضیں بھی ڈوب جاتی ہیں

نہیں ہے کھیل محبت کی آگ میں چلنا
یہ آگ وہ ہے جسے بجلیاں بجھاتی ہیں

تمہاری زلف معنبر کو چومنے کے لیے
سمندروں سے ہوائیں پلٹ کے آتی ہیں

ابھی سے عشرت و آسودگی تلاش نہ کر
یہ منزلیں تو بہت دُور جا کے آتی ہیں

فقیہہ و شیخ کی باتوں پہ اعتبار نہ کر
یہ غزنوی بھی حقیقت میں سومناتی ہیں

مری طلب بھی تنوع پسند ہے ارشدؔ
طرح طرح کی ادائیں اُسے بھی آتی ہیں

ارشد ملتانی

جس کو سوچا تھا سمجھا تھا وہ کیا ہوا
سامنے جو سویرا تھا وہ کیا ہوا

اب جہاں ریت ہی ریت ہے ہر طرف
اس جگہ اک دریا تھا وہ کیا ہوا

اس پہاڑی کے دامن میں تھا ایک گھر
سامنے اُس کے جھرنا تھا وہ کیا ہوا

شب کے کالے گھنے بادلوں میں کہیں
اک ستارا جو چمکا تھا وہ کیا ہوا

ڈوبنا تھا جسے وہ تو ڈوبا مگر
شور ساحل پہ برپا تھا وہ کیا ہوا

اس چمکتی ہوئی شاہ راہ پر کہیں
ایک درویش تنہا تھا وہ کیا ہوا

زندگی کی بہاروں میں ارشدؔ کہیں
اک حسیں خواب دیکھا تھا وہ کیا ہوا

ارشد ملتانی

ہے تیرگیِ شام الم صبح عید رنگ
چمکا ہے کس مقام پہ جا کر شہید رنگ

بے رنگیٔ حیات کا شکوہ فضول ہے
دنیائے رنگ رنگ سے کر لے کشید رنگ

تجھ کو ہی بھا گئی ہے ندامت کی تیرگی
ورنہ قدم قدم پہ ہیں رقصاں جدید رنگ

جن کی نظر سرخیِ خونِ حسین پر
کرتے نہیں قبول وہ ہرگز یزید رنگ

یہ انتخاب تیرا بھرم بھی نہ کھول دے
اک خاص احتیاط سے تو بھی خرید رنگ

ہم سے فروغ پائے گی طرز سخن نئی
ہم نے ملا دیئے ہیں قدیم و جدید رنگ

رنگوں کا اک حسین مرقع ہے زندگی
کچھ بھر دیئے ہیں ہم نے بھی اس میں جدید رنگ

ارشدؔ ہے میر و مومن و غالب کا رنگ خوب
دیتا ہے لطف اور ہی لیکن فرید رنگ

ارشد ملتانی

کھلی آنکھ سے ہر نظارہ کرونگا
جو ہیں راز سب آشکارا کرونگا

بہار جراحت کا سودا نہیں ہے
بس اک زخم دل پہ گزارا کرونگا

نشانے وشانے ہیں بے کار مارے
خلاؤں سے اب تیر مارا کرونگا

بہت دیکھا بالا ہے سود و زیاں کو
برابر میں اب گوشوارہ کرونگا

یہ کیا مقصد و مقصدیت کی رٹ ہے
کرونگا میں سب مٹی گارا کرونگا

نئی ایک دنیا بسانے کی خاطر
تلاش اب نیا اک ستارا کرونگا

ہوئی مجھ سے سرزد جو روزِ ازل میں
حماقت نہ اب وہ دوبارہ کرونگا

بہت ہو چکی موجِ دریا سے دُوری
کناروں سے اب میں کنارا کروں گا

غزل میرے حق میں یہ کیسی ہے ارشدؔ
میں اس بات پر استخارا کرونگا

ارشد ملتانی

آسمانوں سے ہوا جس دم اشارہ شام کا
ڈھلتے دن نے دھیرے دھیرے روپ دھارا شام کا

آؤ چھپ جائیں کسی سرو و سمن کے کنج میں
تک رہا ہے دیر سے ہم کو ستارا شام کا

لطف ساقی ، میکدہ ، جام و سبو کی گردشیں
کتنا معنی آفرین ہے استعارا شام کا

اور کھل اُٹھتی ہے اُس کے سرخ رخساروں کی آنچ
جب شفق آلود ہوتا ہے نظارا شام کا

بزم یاراں فکر و فن ، چائے ، لطیفے ، قہقہے
قرض حسنہ اس طرح ہم نے اُتارا شام کا

کس قرینے ، کس ادا سے حاصل منظر بنے
اُس کے بندے کا نگینہ اور ستارا شام کا

زندگی کی گوناگوں مصروفیت کے باوجود
رابطہ قائم ہے اُن کا اور ہمارا شام کا

میرا دل بھی اس طرف تھا بے قرار و مضطرب
وقت اس نے بھی بہت مشکل گزارا شام کا

مل ہی جاتی ہے جناب محتسب کے فیض سے
ہو ہی جاتا ہے کسی صورت گزارہ شام کا

روز اک دریائے آتش کا ہے ہم کو سامنا
اک کنارا صبح کا ہے اک کنارہ شام کا

جا لگا سیدھا وہ شب کے سینۂ سفاک میں
تیر ارشدؔ کھینچ کر جب میں نے مارا شام کا

قاضی حبیب الرحمٰن

گریہ - اِس بات کا گویا اعلان
زیست کرنا - نہیں ایسا آسان

لاکھ گردش - وہی رنگِ دَوراں
لاکھ کوشش - وہی دل کا بحران

اپنے ہی نشے میں مدہوش رہے
اپنی ہی موج میں ڈوبے طوفان

گھٹ گئی - درد کی شدت ، شاید
بڑھ گیا - اور بھی جی کا خلجان

مستقل (اے وہ کوئی موسم ہو)
مضطرب رکھتا ہے کوئی ہیجان

سو بھی کچھ کم نہ ہوا - ذوقِ حیات
زندگی بھر رہی - غم پر گزران

عالمِ جبر کی وسعت - مت پوچھ
جم گئی ہونٹوں پہ آ کر مسکان

بسکہ ہے زخم کا حاصل - لذت
بسکہ ہے نفع کا پردہ - نقصان

اپنے ویرانے میں خوش بیٹھے تھے
کر دیا - شہرِ طرب نے ویران

اِک تعارف نے یہ صورت دکھلائی
مِٹ گئی دِل سے خود اپنی پہچان

اب تو کوشش سے بھی آتا نہیں یاد
کارِ دنیا میں وہ بھولے اوسان

آج یوں حضرتِ دل - خیر تو ہے؟
چونک چونک اُٹھتے ہو - ہر دم ، ہر آن

کیا ہوا؟ کچھ تو کہو - ہم نظرو!
کیوں ٹھہرتا نہیں اِک شکل پہ دھیان؟

اے - پریشان نظری ، مایۂ تست!
جمعِ خاطر کا بھی کوئی سامان!

شش جہت - دعوتِ نظارہ ہے
کم نگاہی ہے - سراسر کفران

خود سے فرصت سے وہ اک لمحہ سہی
کھلی آنکھوں کبھی دیکھو - یہ جہان!

ایک ہی حرف کی تفسیریں ہیں
وادیاں ، کوہ ، سمندر ، میدان

ایک ہی خواب کی تعبیریں ہیں
سیپیاں ، لعل ، زمرد ، مرجان

جانے کس عکسِ رواں کو دیکھا؟
ایک اک آئنہ - ٹھہرا حیران

کیا خبر؟ کوئی خبر ہو - اِس میں
یہ جو - در پر ہے بیٹھا دربان

اِس سے پہلے تو نہ دیکھے تھے کبھی
اتنے خاموش - حبیب الرحمٰن

فہیم شناس کاظمی

حصارِ ذات سے ایسے نکل رہا ہے کوئی
فضائے کون و مکاں کو بدل رہا ہے کوئی

جہاں سکوت میں ڈوبا ہوا سمندر ہے
وہیں پہ ایک ستارے سا جل رہا ہے کوئی

جہاں خیال پہ طاری جمود ہو جائے
صدا کی طرح وہاں پہ مچل رہا ہے کوئی

کہیں پڑاؤ ہوا تو ملوں گا میں اُس سے
ہر ایک لمحہ مرے ساتھ چل رہا ہے کوئی

نہ جانے کیسی یہ تبدیلی آئی ہے مجھ میں
کہ بات کرنے کو مجھ سے مچل رہا ہے کوئی

نہ جانے کیسے دیاروں کا ہے سفر درپیش
خود اپنے آپ سے آگے نکل رہا ہے کوئی

فہیم شناس کاظمی

دیکھا ہے اُسے پردۂ افلاک سے آگے
اِک نقشِ قدم سرحدِ ادراک سے آگے

حالانکہ میسر تھے ہمیں زہرہ و مرّیخ
کچھ بھی تو نہیں بھایا ہمیں خاک سے آگے

کچھ منظرِ ظاہر کے سوا اور نہ دیکھا
اک باغ تھا گردِ خس و خاشاک سے آگے

خوابوں کی طلب لے کے نکل آئے ہیں گھر سے
پر جائیں کہاں کوچۂ غم ناک سے آگے

ٹوٹے ہوئے سپنوں کی خلش دل میں نہاں ہے
صحرا ہے کوئی دیدۂ نم ناک سے آگے

ہم دیکھتے ہیں بنتے بکھرتے ہوئے منظر
اور علم ہے، جانا ہے کہاں خاک سے آگے

پابندِ رسومات ہوئے ایسے کہ ہم بھی
کچھ دیکھ نہیں پاتے ہیں اب ناک سے آگے

کب سے ہے مرے ہاتھوں کے اِک لمس کا پیاسا
خوشبو بھرا موسم تری پوشاک سے آگے

اے جانِ شناس آؤ کبھی دیکھ کے آئیں
کیا رنگ کھِلے لمحۂ بے باک سے آگے

پرویز ساحر

قصّہ کروں مختصر ہوا کا
کوئی نہیں ہم سفر ہوا کا

تاریخ کے ہاتھ پر دَھرا ہے
ٹوٹا ہوا اِک پر ہوا کا

گو طاق میں چھپ کے چل رہا ہوں
پھر بھی ہے مجھے خطر ہوا کا

اُس کوچۂ خاک و خار و خس میں
اِک نام ہے معتبر ہوا کا

دستک سے کِیے ہیں ہاتھ زخمی
تب جا کے کھلا ہے دَر ہوا کا

جب بھی آئے ، دِیے بجھائے
آتا ہے اُسے ہنر ہوا کا

چرچے ہیں اَب اُس کے بستی بستی
شہرہ ہے نگر نگر ہوا کا

اب تک ہیں دِیے بجھے بجھے سے
اِک شب ہوا تھا گزر ہَوا کا

یوں ناچ رہی وہ پری وش
جوں رقص کرے بھنور ہوا کا

میں اور مِرا اِک چراغ شب بھر
سنتے رہے شور و شر ہوا کا

اِک ریزۂ اَبر ہوں میں ساحؔر
لاحق ہے مجھے بھی ڈر ہوا کا

کاشف حسین غائر

سنبھالے گا ہمیں کیا غم ہمارا
یہ سایہ بھی کوئی دَم ہمارا

تھے ہم اِک اور ہی عالم میں جب تھے
ہے اَب کچھ اور ہی عالم ہمارا

یہ دُنیا ہے کہ دشتِ کربلا ہے
یہ دریا ہے کہ سیلِ غم ہمارا

سوائے گھر کی تنہائی کے گھر میں
ہے کوئی اور بھی ہمدم ہمارا

ہوئے ہیں قتل ہم اپنے ہی ہاتھوں
کرے گا کیا کوئی ماتم ہمارا

یا بدلے ہی نہیں دِن رات اپنے
یا آیا ہی نہیں موسم ہمارا

کاشف حسین غائر

آگ ایسی نہ دُھواں ایسا ہے
کچھ میرا طرزِ فغاں ایسا ہے

مجھ سے ملنے نہیں دیتا مجھ کو
کیا کہوں کارِ جہاں ایسا ہے

ہم تن گوش فضا ہے ایسی
یا ترا حُسنِ بیاں ایسا ہے

دِل بھی مرجھایا مِرا پھول کے ساتھ
کچھ تعلق ہی یہاں ایسا ہے

جو مِرے کرب کو محسوس کرے
کیا کوئی شخص یہاں ایسا ہے

حروفِ زر (قارئین کے خطوط)

(ابنِ حسن۔ گوجرانوالہ)

''انگارے'' نئے سال کی پہلی کتاب موصول ہوئی۔ شکرگزار ہوں۔ اِس بار ''ناصر حسین بخاری صاحب'' کا مضمون خصوصی توجہ کا مرکز رہا کیونکہ اُن کا موجوع عہدِ حاضر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے مختصر سے مضمون میں ثقافت کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ثقافت کی تعریف، ثقافت کی اثر پذیری، تہذیب اور ثقافت کا فرق اور پاکستانی ثقافت کے تضادات ___ اور پھر پاکستانی ثقافت کے حوالے سے مذہب، تعلیم اور معیشت کا ذکر اور آخر میں دانشوروں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے یہ موضوعات اس قدر وسعت کے حامل ہیں کہ ان پر ہزاروں صفحات لکھے جا سکتے ہیں۔ مجھے یہاں پاکستانی ثقافت کے تضادات پر سیاسی اور معاشی حوالوں سے مختصر سی گفتگو کرنی ہے۔

اصل میں آج کے کلچر اور ثقافت کا، آج کے دَور کی سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ پاکستان کے ثقافتی تضادات اس قدر شدید ہو چکے ہیں کہ اب انہوں نے ثقافتی بحران کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور ہمارے اس موجودہ ثقافتی بحران کا براہِ راست تعلق ہماری سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال سے ہے۔ جو ہمارے کلچر یا ثقافت پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی ہے۔ جبکہ ہماری سیاسی اقتصادی صورتِ حال براہِ راست متاثر ہے بین الاقوامی سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال سے۔ اس طرح ہمارے اس ثقافتی بحران کی جڑیں بڑی دُور تک پھیل جاتی ہیں۔

دوسری ثقافتوں سے اثر پذیری ایک فطری اور لابدی عمل ہے اور زندہ ثقافتوں میں ثقافتی لین دین چلتا رہتا ہے۔ خاص طور پر کم ترقی یافتہ ثقافت کا ترقی یافتہ ثقافت سے لینے کا عمل زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے، تاکہ وہ اپنی ثقافت کی اصلاح میں اب تک خسارے کا سودا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ثقافت میں اصلاح کا عنصر پیدا ہونے کی بجائے تخریبی عمل کو فروغ حاصل ہوا۔ اور اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک ہماری غلامانہ ذہنیت اور دوسری ہماری جہالت۔

غلامانہ ذہنیت نے ہم میں محض جامد تقلید کی روش پیدا کر دی جبکہ ہماری جہالت نے کھرے اور کھوٹے کی تفریق مٹا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بین الاقوامی سامراجی طاقتیں اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے پیشِ نظر جن اقدار کو بھی جدید ثقافتی اقدار یا ماڈرن ازم کا لیبل لگا کر ہمارے ہاں سمگل کر دیتی ہیں ہم انہیں قبول کر لیتے ہیں۔ اور یہ عمل ثقافتی اثر پذیری نہیں بلکہ ثقافتی غلبہ کہلاتا ہے۔

اصل میں ثقافتی غلبہ جدید استعماریت کے سب سے اہم خصوصیت ہے۔ جب قوموں کو براہِ راست غلام رکھنا آسان نہ رہا تو سامراج نے براہِ راست غلبہ حاصل کرنے کی بجائے اُن کی تہذیب، ثقافت اور نظریات کو ہی بدل ڈالنے کی ٹھان لی۔ کیونکہ جب ذہنیت، رہن سہن، کلچر وغیرہ ہی بدل کر رکھ دیا جائے اور یہ سب کچھ سامراجی ضروریات کے مطابق ڈھل جائے تو آقا اور غلام کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی محکوموں میں اس کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جدید استعماریت میں یہی کچھ کیا گیا اور اس کے لیے ہمارے

نئے سامراج (امریکہ) کو کچھ زیادہ دُشواری بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ پرانے سامراج (برطانیہ) کے تسلط کے نتیجے میں غلامی ہمارے لاشعور کا حصہ بن چکی تھی اور چند ایسے طبقات بھی پہلے سے یہی موجود تھے جو اپنا سب کچھ سامراجیوں کے حوالے کرنے کو تیار تھے۔ لہٰذا نیا سامراجی نظام انہیں کے ذریعے چلایا گیا۔

پاکستان عوام کی آئیڈیالوجی کی تراش خراش اس طرح کی گئی کہ جس زمین پر انہوں نے باقی قومیتوں کے ساتھ بحیثیت قوم صدیاں گزاریں اس کے ساتھ ہر رشتہ ٹوٹ جائے اور یہاں اُن سامراجیوں کی تہذیب وثقافت کو رواج دیا جائے جنہوں نے تہذیب کے نام پر پوری دنیا کو لُوٹ کھسوٹ کر اُسے کھنڈر بنا دیا۔ یہاں کا طبقہ اعلیٰ تو پہلے ہی مغربی تہذیب وثقافت سے متاثر تھا۔ بلکہ مغرب زدہ تھا۔ اب مغربی سامراج کی ثقافتی تہذیبی یلغار نے شہری طبقے کو بھی اُسی رنگ میں رنگ لیا۔ اس طرح یہاں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس کو سامراج نے متاثر کر کے اپنے مفادات کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ لہٰذا اب ہماری تہذیبی وثقافتی روایات، اخلاقی اقدار اور مذہبی عقائد سامراجیوں کے حق میں اپنی شکلیں بدل رہے ہیں۔

یہ بات ہوئی سامراجی ثقافتی غلبے کی۔ اب ایک اور بات یہ ہے کہ جب ہم نے یہ کہا کہ کم ترقی یافتہ ثقافت، ترقی یافتہ ثقافت سے اَثر پذیر ہوتی ہے، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری اس اصطلاح ''ترقی'' سے کیا مراد ہوتی ہے؟ آج کے دَور میں کسی قوم کی ترقی کا معیار اُس قوم کی مضبوط معیشت اور جدید ٹیکنالوجی کے حوالے سے قائم ہوتا ہے۔ مادی وسائل کی فراوانی اور اُس کے حصول کی دوڑ میں آگے نکل جانے والی قوم ترقی یافتہ کہلاتی ہے۔ لیکن مضبوط اخلاقی نظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ دوڑ استحصال،، ناانصافی اور لاقانونیت کو جنم دیتی ہے۔ ترقی یافتہ اور سامراجی قومیں، کم ترقی یافتہ قوموں کو اور کم ترقی یافتہ قوموں کے وہ طبقات جو اُن سامراجی طاقتوں کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں، اپنی قوم کے غریب طبقات کو اسی لاقانونیت، ناانصافی، جبر اور استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔

یہاں اُن سامراجی نظریات پر مبنی تعلیم سے بھی کام لیا جاتا ہے جس میں مذہبی، سیاسی، فکری اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام (جو سامراجی اور طبقاتی استحصال کا موجب ہے) میں ہی انسانی ترقی مضمر ہے اور اگر دولت کی تقسیم مساویانہ اور منصفانہ نہیں تو کیا ہوا یہ سب مقدر کا لکھا ہوا ہے اور یہ غریبی اور امیری تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

لہٰذا اس صورتِ حال میں ہماری ثقافت میں تضادات دو صورتوں میں نمودار ہوئے۔ ایک تو جدید استعماریت کے ثقافتی غلبے اور استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت، جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مختلف معاشی، معاشرتی اور ثقافتی طبقات میں بٹ گیا۔ اور جبر کی سیاسی قوتوں نے اسے اور گہرا کر دیا۔ ثقافتی تضادات کی دوسری وجہ اسی نظام سے پیدا ہونے والی نفسیاتی صورتِ حال ہے۔ اصل میں استحصال پر مبنی اندھی مادی دوڑ سے افراد میں ذاتی مفاد، عناد، خودغرضی اور اس جیسی دوسری غیر بشری خصوصیات پیدا

ہو جاتی ہیں۔ انہیں غیر بشری خصوصیات اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتی ہیں ___ اور پھر جب یہ غیر بشری خصوصیات فرد کے باطن میں موجود بشری خصوصیات (جو بشر ہونے کے ناطے اُس میں موجود ہیں اور ایک کو دوسرے سے جوڑنے والی ہوتی ہیں) سے ٹکراتی ہیں تو فرد میں نفسی تضاد جنم لیتا ہے۔ اور جب کسی قوم کے افراد کی اکثریت اس نفسی تضاد کا شکار ہو جاتی ہے تو یہ تضاد، ثقافتی تضاد کا روپ دھار لیتا ہے۔

اس لیے جو معاشرہ استحصال، ظلم، لوٹ مار، منافقت، تعصب، نفرت، جھوٹ، ناانصافی اور جبر جیسے غیر انسانی عناصر پر مبنی ہوگا، وہاں ثقافتی تضادات ہی جنم لیں گے اور ایسا معاشرہ ثقافتی بحران کا شکار ہی رہے گا۔

جب کلچر یا ثقافت کی بات ہو تو ہمارے پیشِ نظر ملکی اور قومی ثقافت ہوتی ہے۔ جبکہ قومی یا ملکی ثقافت کی اصل انسانی ثقافت ہے اور اسی انسانی ثقافت پر کیس بھی قومی ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے۔ انسانی ثقافت عالم گیر خصوصیت کی حامل ہے اور اس انسانی ثقافت سے مراد ہو تمام اقدار ہیں جو نہ صرف انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہیں بلکہ انہیں دوسرے انسانوں کے قریب بھی لاتی ہیں۔

کوئی بھی قومی ثقافت، انسانی ثقافت کے بغیر مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ثقافت یا کلچر کی بنیادی اکائی انسان ہی ہے۔

اب اگر اس حوالے سے دیکھیں تو ثقافتی سطح پر پوری دنیا کی صورتِ حال مخدوش دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ ترقی یافتہ قوموں کا قومی کلچر بحران سے پاک نظر آتا ہے مگر اُن کا بین الاقوامی سیاسی اور معاشی استحصالی کردار، اُن کے قول وفعل میں تضاد کی نشان دہی کرتا ہے جس سے اب اُن کی انسانی ثقافت کا بحران اور تضادات کھل کر سامنے آ چکے ہیں۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ اُن کے قومی کلچر کی بنیاد (یعنی انسانی کلچر) انتہائی کمزور ہو چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی مضبوط معیشت اور استحصالی اور سامراجی قوت کے سہارے کب تک اپنی قومی ثقافت کو بحران سے بچا سکتے ہیں۔

اصل میں کوئی بھی ثقافت ایک انسان کے دوسرے انسان کے آپس میں بننے والے صحت مند رشتوں سے جنم لیتی ہے۔ لہٰذا جن معاشروں میں انسان اور انسانیت کو دوسری جملہ اقدار و روایات پر ترجیح دی جائے، وہی معاشرے اصل میں ثقافت کے دعویدار ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں انسانی اقدار تہہ و بالا ہو چکی ہوں، انسانیت اپنی آخری سانسیں لے رہی ہو اور انسان احساس اور شعور سے عاری کسی روبوٹ کا روپ دھار چکا ہو۔ وہاں تضادات سے پاک ثقافت کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

اب اگر ہم پاکستان کے موجود ثقافتی تضادات کے حوالے سے دانشوروں کی ذمہ داری پر بھی روشنی ڈالتے چلیں تو سب سے زیادہ جس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ایسی علمی و فکری فضا کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرنا پڑے گا جو عوام کے شعور و آگہی کے بند دریچوں کو وا کر

دے۔ایسا علم اور شعور جو ثقافتی یلغار اور ثقافتی اثر پذیری میں تفریق کرنے کا اہل ہو۔ جو تعصب، منافقت، لاقانونیت، ناانصافی، فرقہ واریت، جیسی غیر انسانی قدروں کی بیخ کنی کر سکے۔

ہمارے دانشوروں کو انسانیت کے مردہ مفہوم میں معنی کی نئی روح پھونکنا ہوگی اور انسانی اقدار کی تعمیر نو کرنا ہوگی انہیں ہمارے معاشرے میں سیاسی جبر، سامراجی چیرہ دستیوں اور سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے رواج پا جانے والی غیر انسانی اقدار کی مسلسل نشان دہی کرنا ہوگی اور نہ صرف نشان دہی بلکہ ایک ثقافتی تضادات سے پاک معاشرے کی تعمیر میں لوگوں کی فکری سطح پر رہنمائی بھی کرنا ہوگی۔ اور اس کے لیے ہمارے دانشوروں کا انتھک اور مسلسل قلمی جہاد ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا دانشور طبقہ اس ذمہ داری کو نبھانے کا اہل ہے؟ کیونکہ ہمارے ثقافتی تضادات کے شدید اثرات ہمارے دانشوروں پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اُن میں بھی ذہنی اور نفسی تضادات نے جنم لیا ہے۔ جو معاشرے کی علمی و فکری سطح کو متاثر کرنے کا سبب بنے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ المیاتی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے دانشور شدید مایوسی کا شکار ہیں۔ اُن کی اکثریت موجودہ انسانی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے، انسان کے مستقبل سے مایوس نظر آئی ہے اور اس مایوسی کی ایک بڑی وجہ بیسویں صدی کا یہ تصور ہے کہ انسان نے ارتقاء کے تمام مراحل طے کر لیے ہیں۔ لہٰذا آج کی غیر انسانی صورتِ حال کو ہم نے انسان کے ارتقاء کی آخری کڑی سمجھ لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب ہماری نظروں میں انسانی امکانات کے تمام راستے مفقود ہو چکے ہیں۔

اصل میں بیسویں صدی تک کی انسانی ترقی نے انسان کو اس زعم میں مبتلا کر دیا تھا کہ شاید وہ ارتقاء کے تمام مراحل طے کر چکا ہے اور اسی وجہ سے جب اُسے دو عظیم جنگوں میں انسانی وحشت اور درندگی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ انتہا درجہ کی مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اب اُسے روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ لہٰذا دانشوروں کی انسانیت کا مستقبل انتہائی تاریک دکھائی دینے لگا۔ بعد میں بھی چونکہ انسانی درندگی اور بربریت کرۂ ارض پر کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی ہے، اس لیے مایوسی کی یہ فضا بھی چھٹنے کی بجائے ابھی تک قائم ہے۔ لیکن دانشوروں کا یہ مایوسانہ رویہ استحصال کنندہ طبقات کے ہاتھ مضبوط کرنے میں معاون کردار ادا کر رہا ہے، اس لیے اس رویے میں تبدیلی از بس ضروری ہے۔

ہمیں اس اُمید افزاء تصور کو اپنانا ہوگا کہ انسان نے ابھی ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کرنا ہوں اور جس میں دانشور کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اسی طرح مستقبل میں انسانی امکانات کی بہت سی ممکنہ راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس کے باوجود کہ موجودہ انسانی صورتِ حال بڑی مایوس کن ہے، ہمارے دانشوروں کو نئے عزم کے ساتھ تمام انسانی امکانات کا نہ صرف جائزہ لینا ہوگا بلکہ سائنٹیفک بنیادوں پر انہیں بروئے کار لا کر مثبت تبدیلیاں لانے میں بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہے کہ قومی ثقافت کے لیے پہلے انسانی کلچر کا ہونا ضروری ہے اور اگر

ہم اس انسانی کلچر کے فروغ میں کامیاب ہو گئے تو قومی ثقافت کے تضادات بڑی حد تک خود بخود دُور ہو جائیں گے۔ اور اس انسانی کلچر کے فروغ میں ہماری کوششیں عالم گیر سطح کی ہونی چاہئیں۔

(ایم۔خالد فیاض)

نئے سال کی پہلی سوغات کے طور پر ''انگارے'' کا تیرہواں شمار نظر نواز ہوا، چسکیاں لے لے پیاس بجھائی۔ ہماری ذاتی رائے میں اِس جریدے کے ماہنامہ سلسلے کو سہ ماہی سلسلے میں تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اِس کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین کی اسرار زیدی سے متعلق تحریر کردہ مختصر تعارفیہ رائے محبت اور عقیدت کے ملے جلے جذبات پر مشتمل تھی۔ ناصر عباس نیر کا مبسوط تحقیقی و تنقیدی مقالہ بہت پسند آیا۔ اس مقالے میں وہ تنقید کے نئے زاویوں کی طرف اشارہ نما ہیں ان کے مقالوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خالصتاً ادبی زبان کو استعمال میں لاتے ہیں۔ ہم انہیں موجودہ عہد کے چند اہم تنقید نگاروں اور محققین میں شمار کر سکتے ہیں۔ ابنِ حسن کا سلسلہ وار مضمون جمالیات ۳، بہت عمدگی کا حامل ہے۔ وہ اسے بہ حسن و خوبی آگے بڑھا رہے ہیں اور طرح طرح کے سوال بھی اُٹھاتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی مکتوبی رائے میں خاصا وزن ہے، ابنِ حسن کو اس پر توجہ دینی چاہیے۔ ناصر حسین بخاری کی پاکستانی ثقافت کے تضادات، کے حوالے سے تحریر خاصی معنی خیز ہے۔ اب کچھ ذکر گوشۂ خاور اعجاز کے بارے۔ خاور غزلوں کو چھوڑ کر باقی پانچوں غزلیں دل کو لبھائیں۔ یہاں ہم یہ جرأتِ رِندانہ ایک نکتۂ اعتراض اُٹھانا چاہیں گے۔ مذکورہ گوشے میں (ص ۶۰) پر موجود تیسری غزل، جس کا مطلع ہے ؎

جذبۂ دل کی صدا کافی ہے
ہم کو یہ راہ نُما کافی ہے

اس غزل کے بارے خاور صاحب کو شدید علمی و ادبی مغالطہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ پوری غزل (حرف بہ حرف) پروفیسر افتخار مُغل کی ہے، خاور صاحب کی نہیں (بحوالہ مطبوعہ شعری مجموعہ ''انکشاف'' ص ۲۰۵)۔ یہ غزل کئی سال قبل سہ ماہی شعر و سخن مانسہرہ میں بھی اشاعت آشنا ہو چکی ہے۔ ممکن ہے غزلیں بھیجتے ہوئے غلطی سے یہ غزل اُنہوں نے ''انگارے'' کے لیے ارسال کر دی ہو، بہر حال انہیں اِس کی تحریری وضاحت ضرور کرنی چاہیے کیونکہ یہ بہت بڑا ادبی مغالطہ ہے۔

اب ذرا غزل کی سبھا میں داخل ہوتے ہیں۔ غزلوں میں صرف قیوم طاہر کی غزل پسند آئی (اور وہ بھی غلطی سے دوبارہ اشاعت پذیر ہو گئی ہے) ہاں باقی غزلوں میں چند اشعار نے ذہن و دل پر دستک دی۔ ان اشعار میں شگفتگی خیال اور تازگی بیان شد و مد سے موجود ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

۱۔ ہم آگے بڑھ کے بھی اُلٹی طرف ہی جائیں گے۔ نقوشِ پا تو پچھل پائیوں کے پائے ہیں
اصغر علی شاہ

۲۔ شہر سوجاتا ہے- اور میں شب بھر- جاگتا رہتا ہوں (حیرت کا مکان)
قاضی حبیب الرحمٰن

۳۔ عذابِ دَربدری کب کسی سے اُٹھتا تھا- سو ہم ہی آگے بڑھے اور پھر بڑھے یوں ہی
فہیم شناس کاظمی

۴۔ اک گلشنِ رنگ، ہَر سُو رواں ہے- یوں تیرتے ہیں، منظر ہوا میں
عطاالرحمٰن قاضی

نظموں میں ڈاکٹر خیال امروہوی اور نوشی انجم کی نظمیں متاثر کن تھیں۔ خیال امروہوی کی نظم و آگہی کے خمیازے، کے ہر مصرعے سے اُن کی آگہی پھوٹ رہی ہے۔ مثال کے طور پر وہ

حریت بھی وہم ہے اور وہم تو پھر وہم ہے
آدمی ہر آن ہے حیوانیت کی قید میں

نوشی انجم کی نظم دسمبر کے بھیگے ہوئے موسم میں ہونے والی رومانوی واردات ہے۔

حروفِ زر، میں اب کی بار صرف ڈاکٹر انور سدید کا طوطی بولتا نظر آیا ہے۔ انہوں نے بڑے محتاط انداز میں بعض اسباب کی تحریروں پر تنقیدی ضربیں لگائیں۔

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

''انگارے'' ۱۳ وصول ہوا۔ سب سے پہلے تو آپ کو مبارک باد کہ ''انگارے'' باخیر و عافیت سے ایک سال کا ہوا۔ میں تمام تر نیک خواہشات ''انگارے'' اور آپ کے نام کرتا ہوں۔

موجودہ شمارے میں آپ نے اپنی بات میں اہم سوال اُٹھائے ہیں خصوصاً نظریات سے پاک معاشرہ کی تشکیل اور ہجرت جیسے کرب آمیز عمل کو فروغ دینے کے رجحانات۔

نظریات کے حوالے سے محسن بھوپالی نے کیا خوب شعر کہا ہے کہ

ہماری جان پہ دُہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

اور میں نے کہا تھا:

جہاں پر قتل کی جاتی ہوں سوچیں
پیمبر ہے وہاں جو سوچتا ہے

لہٰذا کارِ پیمبری ہر کسی کا کام نہیں اذہان کی تربیت اور معاشرتی ارتقاء کے لیے ''گروہِ عاشقاں'' ہی لہو میں نہا کر جادۂ حیات میں روشنی کرتا ہے۔ ہمارا نوجوان ''وہم و گمان'' کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے ایک سمت مذہب اور اس کی راہ میں آنے والی تکالیف ہیں اور دوسری سمت زندگی کے اپنے تقاضے، حکمرانوں کا جبر اور جھوٹ ہے سو وہ کیا کرے ہجرت اس کا آسان حل ہے۔

موجودہ شمارے میں ڈاکٹر صلاح الدین حیدر نے اسرار زیدی کے حوالے سے اپنی یادداشتیں خوبصورت انداز میں تحریر کی ہیں میری اسرار زیدی سے اشرف سلیم کے دفتر میں ایک ملاقات ہوئی تھی یہ مضمون پڑھ کر وہ یاد جاگ اُٹھی۔

ناصر عباس نیر، ابنِ حسن اور ناصر حسین بخاری کے مضامین بھرپور ہیں۔ ناصر حسین بخاری نے مشکل موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور اس موضوع کا بھرپور احاطہ کرنے کی ضرورت ہے۔

خالد سعید کا ''ایک مرد'' ہر قسط میں اور دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ خالد سعید کا رواں دواں ترجمہ تخلیقیت کے نزدیک ترین ہے۔

غزلوں میں اصغر علی شاہ، قیوم طاہر اور احسن سلیم کی غزلیں پسند آئیں۔ احسن سلیم کم لکھتے ہیں لیکن کمال لکھتے ہیں۔ قیوم طاہر اور احسن سلیم مجھ سے سینئر ہیں لہٰذا ان کی غزلیں مجھ سے پہلے ہونی چاہیے تھیں اسی طرح گذشتہ شمارے میں رسا صاحب کی غزل بھی ہے۔ رسا صاحب ''شاعرِ عصر'' کے خطاب یافتہ ہیں اور ہمارے بزرگ شعرا میں سرفہرست ہیں۔ خاور اعجاز کی غزلیں بھی اچھی لگیں مگر ان کی تنقید جتنی اچھی نہیں ہیں۔

(فہیم شناس کاظمی۔ نواب شاہ، سندھ)

رسید اور اطلاع:

محمد سلیم الرحمٰن (لاہور)، ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)، افتخار عارف (اسلام آباد)، احمد صغیر صدیقی (کراچی)، نکہت بریلوی (کراچی)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، قاضی عطاالرحمٰن (عارف والا)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، خالد سنجرانی (لاہور)، ناصر عباس نیر (جھنگ) سعید اقبال سعدی (گوجرانوالہ)